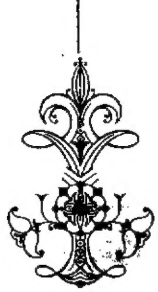
کشکول



خواجہ شمس الدین عظیمی

مکتبہ عظیمیہ اردو بازار لاہور



انتساب

سعید رُوح نوجوان نسل کے نام
اور
اِس دُنیا سے اُس پار ماورائی دُنیا میں
سفر کرنے والے حضرات و خواتین کے نام
جو
رحمت اللعالمین حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے
روحانی مشن کے لئے تن من دھن سب کچھ
قربان کر دینا چاہتے ہیں۔

عظیمی پرنٹرز
ناظم آباد نمبر ۱، کراچی

آوازِ سروش

کائنات کیا ہے ؟ ——— ایک نقطہ ہے ——— نقطہ نور ہے اور نور روشنی ہے۔

ہر نقطہ تجلی کا عکس ہے۔ یہ عکس جب نور اور روشنی میں منتقل ہوتا ہے تو جسمِ مثالی بن جاتا ہے۔ جسمِ مثالی (AURA) کا مظاہرہ گوشت پوست کا جسم ہے۔

ہڈیوں کے پنجرے پر قائم عمارت گوشت اور پٹھوں پر کھڑی ہے۔ کھال اس عمارت کے اوپر پلاسٹر اور رنگ و روغن ہے۔ وریدوں، شریانوں، اعصاب، ہڈیوں، گوشت اور پوست سے مرکب آدم زاد کی زندگی حواس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

حواس کی تعداد پانچ بتائی جاتی ہے۔ جب کہ ایک انسان کے اندر ساڑھے گیارہ ہزار حواس کام کرتے ہیں۔

آدم زاد کے دو روپ ہیں ——— ایک ظاہر روپ، دوسرا باطن روپ۔ باطن روپ میں روح کا عمل دخل ہے۔ روح کائنات کے ہر ذرّے میں مستقل گشت کرتی رہتی ہے۔ کائنات میں جتنی تخلیقات ہیں اور کائنات میں جتنے عناصر ہیں، جتنے ذرات ہیں، ہر ذرّہ (CELL) روح کی تحریکات پر زندہ ہے۔

روح جب تک اپنا رشتہ جوڑے رہتی ہے زندگی مسلسل حرکت ہے اور جب روح جسم سے رشتہ توڑ لیتی ہے تو حرکت معدوم ہو جاتی ہے۔

روح کے لاکھوں، کروڑوں روپ ہیں اور ہر روپ ایک بہروپ ہے ——— آدم زاد ایک طرف روح ہے تو دوسری طرف روح کا بہروپ ہے۔ روپ بہروپ کی یہ کہانی اَزل میں شروع ہوئی اور اَبد تک قائم رہے گی ——— یہ کہانی دراصل ایک ڈرامہ ہے۔ مختلف روپ (افراد) آتے ہیں اور اسٹیج پر اپنے کردار (بہروپ) کا مظاہرہ کر کے چلے جاتے ہیں۔

روپ بہروپ کا یہ مظاہرہ ہی ماضی، حال اور مستقبل ہے۔ میں چونسٹھ سال کا آدمی دراصل بچپن، جوانی اور بڑھاپے کا بہروپ ہوں ؎

کہیں کی اینٹ، کہیں کا روڑا
بھان متی نے کنبہ جوڑا

میں نے چونسٹھ سال میں تیئیس ہزار تین سو ساٹھ (23360) سورج دیکھے ہیں۔ ہر نیا سورج میرے بہروپ کا شاہد ہے۔ تیئیس ہزار سے زیادہ سورج میری زندگی میں ماضی، حال اور مستقبل کی تعمیر کرتے رہے ——— میں اب تھک گیا ہوں ——— لیکن میرے ساتھ چپکے ہوئے ماضی، حال اور مستقبل میرے روپ کے مزید بہروپ بنانے پر مستعد نظر آتے ہیں۔

روپ بہروپ کی یہ داستان اَلمناک بھی ہے اور مسرت آگیں بھی۔ میں اس اَلمناک اور مسرت آگیں کرداروں کو گھاٹ گھاٹ پانی پی کر کاسۂ گدائی میں جمع کرتا رہا اور اب جب کہ کاسۂ گدائی لبریز ہو گیا ہے میں آپ کی خدمت میں روپ بہروپ کی یہ کہانی پیش کر رہا ہوں۔

خواجہ شمس الدین عظیمی
یکم دسمبر ۱۹۹۰ء


فہرست

(۱) آسمانی کتابوں کے مطابق سکون حاصل کرنے کا مؤثر طریقہ یہ ہے کہ انسان غصہ نہ کرے اور کسی بات پر پیچ و تاب نہ کھائے۔ عملی جدوجہد میں کوتاہی نہ کرے اور نتیجے کے اوپر نظر نہ رکھے۔ زمین پر بسنے والی قومیں زندگی کے جن اصولوں پر کاربند ہیں اُن کا مطالعہ کرے۔ قانونِ فطرت میں کہیں جھول نہیں ہے۔ ہر چیز وقت کے ہاتھوں میں کھلونا بنی ہوئی ہے۔ وقت جس طرح سے چابی بھر دیتا ہے شے حرکت کرنے لگتی ہے۔ وقت اپنا رشتہ توڑ لیتا ہے تو کھلونے میں چابی ختم ہو جاتی ہے۔ کل پُرزے سب ہوتے ہیں لیکن قوّت (ENERGY) باقی نہیں رہتی۔ وقت قوت کا مظاہرہ ہے۔ قوت ایک توانائی ہے، ایک مرکز ہے اور اسی مرکز کو آسمانی کتابیں قدرت کے نام سے متعارف کراتی ہیں۔ قدرت ایک ایسا مرکزی نقطہ ہے جس نقطے کے ساتھ پوری کائنات کے افراد بندھے ہوئے ہیں۔ وجود اور عدم دونوں اس میں گم ہیں۔ انسان جب کائنات کے مرکزی نقطے سے اپنا رشتہ تلاش کر لیتا ہے اور خالق کائنات کو جان لیتا ہے تو دنیا سے اس کی ساری توقعات ختم ہو جاتی ہیں اور جب ایسا ہو جاتا ہے تو مسرتیں اس کے گرد طواف کرتی ہیں اور موت کی آنکھ اُسے مامتا سے دیکھتی ہے، اس کے قریب آنے سے پہلے دستک دیتی ہے اور اجازت کی طلبگار ہوتی ہے۔

(۲) کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا بار بار یا زیادہ صحیح اندازوں کے مطابق ۱۶ مرتبہ تباہ ہو کر دوبارہ آباد ہوئی ہے۔ خوبصورت، رنگین، باغ و بہار سے مزیّن، پُرکشش برفانی کہساروں، موتی کی طرح چمکتے دمکتے آبشاروں، آفتاب کی شعاعوں اور چاند کی کرنوں کا مسکن یہ دنیا اب پھر چالیس ہزار ایٹم بموں کی زد میں موت کے دہانے پر کھڑی ہانپ رہی ہے۔ یہ کیسی ترقی ہے کہ ہم نے آتش فشاں کو اپنا مسکن بنا لیا ہے۔ بالآخر ترقی کا یہ فسوں ایک دن ٹوٹ جائے گا۔ اس سے پہلے بھی ہوتا رہا ہے کہ وہ قومیں جو فنا اور بقا کے فارمولوں سے نا آشنا ہو گئی تھیں زمین پر سے اُٹھا لی گئیں اور آج ان کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔ ذرا سوچئے تو سہی، تباہی ہمارے تعاقب میں ہے اور ہم اُسے ترقی کا نام دے کر خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔ ایک روز فسوں ساز لوگوں کو یہ باور کرنا ہو گا کہ ایٹمی ہتھیار نوعِ انسانی کے لئے ترقی نہیں بلکہ انسانی نسل کے لئے دہکتی بھٹی ہے۔ یہ اربوں کھربوں ڈالر نوعِ انسانی کی بقا اور خوشحالی کے کام آتے مگر انسان دشمن سائنسدانوں نے ان ڈالروں کو بھٹی میں جھونک دیئے ہیں۔ کوئی نجات دہندہ آئے گا اور آتش گیر فسوں کو راکھ کے ڈھیر میں بدل دے گا تاکہ نوعِ انسانی سکون و آشتی کا سانس لے سکے۔

(۳) شعوری حواس میں کام کرنے والی لہریں مثلث (TRIANGLE) ہوتی ہیں۔ اور لاشعوری حواس میں کام کرنے والی لہریں دائرہ (CIRCLE) ہوتی ہیں۔ زمین کی حرکت دو رُخ پر قائم ہے۔ ایک رُخ کا نام طولانی حرکت ہے اور دوسرے رُخ کا نام محوری حرکت ہے یعنی زمین جب اپنے مدار پر حرکت کرتی ہے تو وہ طولانی گردش میں ترچھی ہو کر چلتی ہے اور محوری گردش میں لٹو کی طرح گھومتی ہے۔ طولانی گردش مثلث ہے اور محوری گردش دائرہ ہے۔ ہماری زمین پر تین مخلوق آباد ہیں۔ انسان، جنات اور ملائکہ عنصری۔ انسان کی تخلیق میں بحیثیت گوشت پوست مثلث غالب ہے۔ اس کے برعکس جنات میں دائرہ غالب ہے اور فرشتوں کی تخلیق میں جنات کے مقابلے میں دائرہ زیادہ غالب ہے۔ انسان کے بھی دو رُخ ہیں۔ غالب مثلث اور مغلوب رُخ دائرہ۔ جب کسی بندہ پر مثلث کا غلبہ کم ہو جاتا ہے اور دائرہ غالب آجاتا ہے تو وہ جنات، فرشتوں اور دوسرے سیاروں میں آباد مخلوق سے متعارف ہو جاتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ متعارف ہو جاتا ہے بلکہ ان سے گفتگو بھی کر سکتا ہے۔ طولانی گردش مشرق اور مغرب کی سمت میں سفر کرتی ہے اور محوری گردش شمال سے جنوب کی طرف رُواں دَواں ہے۔

(۴) چند خلاباز خلا میں جا چکے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سو میل سے زیادہ بلندی پر بالکل بے وزنی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اب صحیح صورتِ حال سمجھنا چاہیں تو یہ نظر آئے گا یا یہ حقیقت منکشف ہوگی کہ ساڑھے تین ارب انسان اور چلنے پھرنے والے چوپائے سب کے سب ٹانگوں کے بل زمین سے لٹکے ہوئے ہیں۔ ہر انسان یہ کہتا ہے کہ میں زمین پر پیروں کے بل چل رہا ہوں۔ غور کیجئے وہ کتنی غلطیات کہہ رہا ہے۔ جب سے نوعِ انسانی آباد ہے وہ تمام لوگ جن پر حقیقت منکشف نہیں ہوئی ہے یہی کہتے ہیں، یہی سمجھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب آدمی پیروں کے بل لٹک رہا ہے تو چل کیسے سکتا ہے۔ لٹکنے کی حالت بالکل جبری ہے۔ جبری حالت میں اس کا ارادہ بے معنی ہے اس لئے کہ اس کی اپنی کوئی حرکت ممکن نہیں۔ یہ بات تو قرینِ قیاس ہے کہ جن تاروں میں اس کے پیر بندھے ہوئے ہیں وہ تار حرکت کرتے ہوں اور ان کے ساتھ پیر بھی حرکت کرتے ہوں۔ ان تاروں سے انسان کے ارادے کا کیا تعلق جب کہ انسان کو ان تاروں کا کوئی علم ہی نہیں۔ باوجود اتنی صریح غلطیوں کے وہ دعوے کرتا ہے کہ میرا سر بلندی کی طرف ہے اور میرے پیر نیچے کی طرف اور میں چلتا پھرتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو ایک بتوا بنا لیا ہے اور کہتا ہے کہ یہ بتوا حقیقت ہے۔

(۵) اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں "یہ کتاب ان لوگوں کو روشنی دکھاتی ہے جو اپنے اندر اللہ کے بارے میں ذوق رکھتے ہیں۔" دوسری جگہ ارشاد ہے "میں نے انسان کو بجتی مٹی سے بنایا ہے۔"

یہاں مٹی کی فطرت (NATURE) بیان کی گئی ہے جو خلا ہے۔ یہ بات سمجھنا بہت آسان ہے کہ ذوق میں نہ وزن ہوتا ہے نہ ذوق کے لئے فاصلہ کوئی معنی رکھتا ہے، نہ ذوق زمین و آسمان کی حدود کا پابند ہے، نہ اُسے وقت پابند بنا سکتا ہے یہی ذوق چلتا پھرتا ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ انسان اس سے اس وقت تک متعارف نہیں ہوتا جب تک اس سے تعارف حاصل نہ کرلے۔ جب تعارف حاصل کرلیتا ہے تو اُسے معلوم ہوجاتا ہے کہ یہی ذوقِ انسان ہے۔ یہ پوری کائنات میں آزاد ہے، فرشتوں کا سربراہ ہے، اللہ کی بہترین صنعت ہے اور کائنات میں اللہ کا نائب ہے۔ نہ وہ پیروں سے چلنے اور ہاتھوں سے پکڑنے کا پابند ہے، نہ وہ آنکھوں سے دیکھنے اور کانوں سے سننے کا محتاج ہے۔ یہ ساری خرافات انسان نے آپ ہی تخلیق کی ہیں اور آپ ہی ڈھول بجاتا پھرتا ہے کہ ہائے میں تو بالکل مجبور ہوں۔

(۶) یہ زمانہ جس میں ہم اور آپ یکساں طور پر کشمکش اور ابتلا کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور جہاں ہر طرف مادیت کی یلغار ہے، بتدریج اپنے انجام کی طرف بڑھ رہا ہے۔ مادیت کی تیز روشنی میں بصارت کی خیرگی اور دل سوز علین ہے مگر رُوح کی لطافت اور بصیرت کی نمی نہیں ہے۔ جس طرح مادیت کو قرار اور دوام نہیں ہے، اسی طرح مادیت کی بنیاد پر جو عمارت تعمیر ہوگی وہ دیر یا سویر ضرور زمیں بوس ہوجائے گی۔ یہ نظامِ قدرت ہے اور کوئی اس کا توڑ نہیں۔

مسلمانوں کے اوپر فرض ہے کہ وہ دنیاوی فنون و کمالات حاصل کر کے خود کو بلند ترین مقامات پر فائز کرنے کے لئے کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھیں مگر اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی فراموش نہ کی جائے کہ یہ معاشی اور مادی ترقی اور خوش حالی ہی زندگی کا مقصد نہیں ہے۔ بصارتِ چشم سے زیادہ بصیرتِ قلب پر فکری اور عملی توجہ مرکوز رہنی چاہیئے بقول علامہ اقبال ؎

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نُور دِل کا نُور نہیں

(۷) اللہ تعالیٰ کا ہر اسم اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور اللہ تعالیٰ کی ہر صفت قانونِ قدرت کے تحت فعّال اور متحرک ہے۔ ہر صفت اپنے اندر طاقت اور زندگی رکھتی ہے۔ جب ہم کسی اسم کا ورد کرتے ہیں تو اس اسم کی طاقت اور تاثیر کا ظاہر ہونا ضروری ہے۔ اگر مطلوبہ فوائد حاصل نہ ہوں تو ہمیں اپنی کوتاہیوں اور پُرخطا طرزِ عمل کا جائزہ لینا چاہیئے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ علاج میں دوا کے ساتھ پرہیز ضروری ہے اور بدپرہیزی سے دوا غیر مؤثر ہو جاتی ہے۔ کوتاہیوں اور خطاؤں کے مرض میں جو پرہیز ضروری ہے وہ یہ ہے۔ حلال روزی کا حصول، جھوٹ سے نفرت، سچ سے محبت، اللہ کی مخلوق سے ہمدردی، ظاہر اور باطن میں یکسانیت، منافقت سے دل بیزاری، فساد اور شر سے احتراز، غرور و تکبر سے اجتناب، کوئی منافق سخت دل، اللہ کی مخلوق کو کمتر جاننے والا اور خود کو دوسروں سے برتر سمجھنے والا بندہ اسمائے الٰہیہ کے خواص سے فائدہ نہیں حاصل کرسکتا۔ کسی اسم کا ورد کرنے سے پہلے مذکورہ بالا صلاحیتوں اور اوصاف کو اپنے اندر پیدا کرنا ضروری ہے۔

(۸) جب تک مذہب اور خدا کے بارے میں ہمارے اندر فلسفیا
انداز اور منطقی استدلال موجود رہتا ہے ہم کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتے اس لئے کہ ماورا ہستی کو سمجھنے کے لئے ماورائی شعور کا ہونا بھی ضروری ہے۔ پس ثابت یہ ہوا کہ مذہب ماورائی ہستی اور صداقت کی اصل اساس ہمارا غیر شعوری عقیدہ اور وجدان ہے۔ جب ہم وجدان میں قدم بڑھا دیتے ہیں تو فطرت ہماری رہنمائی کرتی ہے اور عقل اس کی پیروی کرتی ہے۔ یہ بات مشاہدہ میں ہے کہ جن لوگوں کے اُوپر وجدان کی دنیا روشن ہوگئی ان لوگوں کے اندر خدا کے عدم وجود کے بارے میں خواہ کیسے بھی بلند دلائل پیش کیئے گئے ان کے عقیدے میں اور ان کی طرزِ فکر میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ یہ حقیقت اس طرف راہنمائی کرتی ہے کہ وجدان ایک ایسا عالم ہے جس عالم میں ہر لمحہ، ہر آن حقیقتیں عکس ریز ہوتی رہتی ہیں۔ عالمِ وجدان میں سفر کرنے والا مسافر وہ سب کچھ دیکھ لیتا ہے جو عقل کی پہنائیوں میں گم رہنے والا بندہ نہیں دیکھتا۔

(۹) "جب اُن کے سامنے آیاتِ الٰہی کی تفسیر پیش کی جاتی ہے تو اُن کے سینے منوّر ہو جاتے ہیں۔" (سورۃ انفال) تاریکیوں سے نکلنے، حزن و ملال کی زندگی سے آزاد ہونے، اقوامِ عالم میں مقتدر ہونے، دل و دماغ کو انوارِ الٰہیہ کا نشیمن بنانے، نظامِ ربوبیت اور خالقیت کو سمجھنے کے لئے صحیفۂ کائنات کے ذرّے ذرّے کا مطالعہ کرو۔ صحیفۂ کائنات کے ایک ایک جزو کی تشریح قرآن میں موجود ہے قرآن جہاں تسخیرِ کائنات کے فارمولوں کی دستاویز ہے وہاں انسانی زندگی کے لئے ایک دستور ہے۔ اس دستاویز میں ایسے راستوں کی نشاندہی کی گئی ہے جن پر چل کر ذلت عزت میں، شکست فتح میں، کمزوری قوت میں، بدحالی خوش حالی میں اور انتشار وحدت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اللہ کا قانون ہمہ گیر ہے، سب کے لئے ہے۔ جس طرح ہر آدمی متعین فارمولے سے کوئی چیز بنا لیتا ہے، اسی طرح صحیفۂ ہدایت میں غور و فکر کر کے اپنے لئے ایک منزل متعین کی جا سکتی ہے۔

(۱۰) روحانیت میں غیب کے مشاہدے کی ایک نظر "سیر" ہے۔ سیر کی آنکھ یہ دیکھتی ہے کہ کائنات کا سارا یکجائی پروگرام لوحِ محفوظ پر منقوش ہے اور لوحِ محفوظ کا منقوش پروگرام خالقِ کائنات کی تجلّی سے بے شمار زمینوں (SCREENS) پر ڈسپلے ہو رہا ہے۔ تقریباً ساڑھے گیارہ ہزار نوعیں اور انسانی شماریات سے زیادہ ان نوعوں کے افراد کائنات کے کل پرزے ہیں۔ یہ کائناتی مشین ایک دائرے (CIRCLE) میں چل رہی ہے۔ جزوِ لاتجزیٰ وجود سے اس کی حرکت شروع ہوتی ہے اور ماورا ہستی کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ آسمان، زمین، درخت، پہاڑ، چرندے، پرندے، حشرات الارض، فرشتے، جنّات اور انسان سب اس عظیم الشان نظام کے اجزاء ہیں جن کے اشتراک سے حرکت کا منظّم سلسلہ جاری و ساری ہے۔ البتہ انسان ایسا واحد فرد ہے جو نظامِ کائنات کی میکانزم سے واقف ہے۔ باقی مخلوق اس میکانزم سے واقفیت نہیں رکھتی۔

(۱۱) بات کچھ اس طرح ہے کہ ایک آدمی کے لئے پیدا کرنے والی ہستی نے ایک لاکھ روپے جمع کرائے اسی طرح جیسے ایک لاکھ روپے کسی بینک میں جمع کر دیئے جاتے ہیں۔ وسائل کو استعمال کرنے کے لئے آدمی کوشش اور جدوجہد کرتا ہے۔ کوشش اور جدوجہد جیسے جیسے کامیابی کے مراحل طے کرتی ہے اس کو روپیہ ملتا رہتا ہے اور ضرورت پوری ہوتی رہتی ہے۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ اٹل ہے کہ اگر کائناتی فلم (لوحِ محفوظ) میں وسائل کا ریکارڈ اور زرِمبادلہ متعین نہ ہو تو ڈسپلے (DISPLAY) ہونے والی فلم نامکمل رہے گی۔ ایک آدمی کے نام سے بینک میں کروڑوں روپے کا زرِمبادلہ موجود ہے لیکن اگر وہ اسے استعمال نہ کرے تو یہ زرِمبادلہ اس کے کام نہیں آئے گا۔ کوشش اور جدوجہد دراصل چیک کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس طرح چیک لکھ کر بینک سے روپیہ نکلوایا جاتا ہے اسی طرح معاش کے حصول میں جدوجہد لوحِ محفوظ سے وسائل حاصل کرنے کے لئے کیش چیک ہے۔

(۱۲) ۱۴۔ اگست کا سورج جوں ہی اُفق سے نمودار ہوا، اس کی شعاعوں میں ایک پیغام تھا کہ ایک قوم دوسری قوم سے آزادی حاصل کر کے اپنی نسل کے لئے ایک فلاحی مملکت قائم کرے۔ بھوکی اور ننگی قوم پر قدرت نے اپنے خزانے کھول دیئے تاکہ قوم وسائل کی کمی کا شکوہ نہ کرے اور قوم کے فلاحی کاموں میں کوئی رخنہ درانداز نہ ہو۔ ایک نسل ختم ہو گئی۔ ایک نسل جوان ہو کر بڑھاپے کی طرف گامزن ہے اور ایک نسل جوان ہو رہی ہے۔ تینوں نسلوں کو فرشتے ترغیبی پروگرام INSPIRE کرتے رہے مگر جیسے جیسے قدرت کا انعام عام ہوتا رہا، قوم کے اندر زر اور زمین کی ہوس بڑھتی گئی اور یہ حرص و ہوس قوم کے جسم کے لئے ناسور بن گئی۔ قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ دھرتی پر وہی قومیں زندہ رہتی ہیں جو اپنے ماضی کو یاد رکھتی ہیں اور حال میں کئے ہوئے اعمال کا محاسبہ کرتی ہیں۔

(۱۳) اللہ تعالیٰ نے انسان کو ساکت و صامت شجرہ نہیں بلکہ بولتا، چلتا پھرتا، کھاتا پیتا، سوچتا سمجھتا انسان بنایا ہے۔ فرش سے عرش تک اس کا ایک قدم ہے۔ سوئی کا روزن اور آسمانوں کی کھلی فضا، ایک ستارے سے دوسرے ستارے تک کا فاصلہ اس کے لئے ایک معنی رکھتا ہے۔ وہ نہ کہیں رُکتا ہے نہ راستہ کھوٹا کرتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ وہ خود کو جانتا نہیں کہ میں کیا ہوں اور کائنات کیا ہے۔ حضورؐ کا نوعِ انسانی پر یہ سب سے بڑا احسان ہے کہ انہوں نے ان تمام رازوں کو واشگاف کر کے رکھ دیا۔ یہ سب راز انہوں نے از خود منکشف نہیں کر دیئے تھے بلکہ اُن پر اللہ نے کھولے۔ من و عن انہوں نے قرآن کی صورت میں ریکارڈ کرا دیا۔ انہوں نے ساری زندگی کی جفاکشی سہہ کر اس امانت کو نوعِ انسانی کے حوالے کیا۔ نوعِ انسانی نے جو قدر کی ہے وہ ظاہر ہے۔ اللہ نے اسی علم کو کتاب کا علم فرمایا ہے۔ ہر انسان اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے چاہے اس کا نام زید ہو، بکر ہو یا عمر ہو۔

(۱۴) مراقبے کے ذریعے انسان عالمِ ظاہر کی طرح عالمِ باطن کی دنیا سے روشناس ہوتا ہے۔ جب سالک غیب کی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے تو جس طرح وہ عالمِ ناسوت یا اس دنیا میں زندگی گزارتا ہے اور زندگی کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے اسی طرح وہ غیب کی دنیا میں نظامِ شمسی اور بے شمار افلاک کو دیکھتا ہے، فرشتوں سے متعارف ہوتا ہے۔ اس کے سامنے وہ تمام حقائق آجاتے ہیں جن حقائق پر یہ کائنات تخلیق ہوئی ہے۔ وہ یہ بھی دیکھ لیتا ہے کہ کائنات کی ساخت میں کس قسم کی روشنیاں برسرِ عمل ہیں ان روشنیوں کا منبع (SOURCE) کیا ہے، یہ روشنیاں کس طرح تخلیق ہو رہی ہیں، افرادِ کائنات میں کس طرح تقسیم ہو رہی ہیں اور روشنیوں کی مقداروں کی رد و بدل سے کائنات کے نقوش کس طرح بن رہے ہیں۔ روحانی آدمی کی آنکھ یہ بھی دیکھ لیتی ہے کہ روشنیوں کا منبع انوار ہیں۔ پھر اس پر وہ تجلّی بھی منکشف ہو جاتی ہے جو روشنیوں کو سنبھالنے والے انوار کی اصل ہے۔

(۱۵) منفی سوچ اتنی زیادہ عام کیوں ہے کہ آدمی ان چیزوں سے خوش نہیں ہوتا جو اسے حاصل ہیں۔ ان خواہشات کے پیچھے کیوں سرگرداں ہے جن کے حصول میں وہ اعتدال کی زندگی سے رُوگردانی پر مجبور ہے۔ اس کا ایک ہی جواب ہے کہ ہم صبر و استغنا کی نعمتوں سے محروم ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ جو لوگ صابر و شاکر اور مستغنی نہیں ہیں فانی کائنات سے دور ہو جاتے ہیں۔ سکون و عافیت اور اطمینانِ قلوب دبیز پردوں میں چھپ جاتے ہیں۔

سکون اور خوشی کوئی خارجی شے نہیں ہے۔ یہ ایک اندرونی کیفیت ہے اس اندرونی کیفیت سے جب ہم آشنا ہو جاتے ہیں، سکون و اطمینان کی بارش ہونے لگتی ہے۔ بندہ اس ہمہ گیر طرزِ فکر سے آشنا ہو کر مصیبتوں، پریشانیوں اور عذابناک زندگی سے رستگاری حاصل کر کے اس حقیقی مسرت اور شادمانی سے واقف ہو جاتا ہے جو بندوں کا حق اور ورثہ ہے۔

(۱۶) قانون یہ ہے کہ ڈر اور خوف دو انسانوں کے درمیان، انسان اور درندوں کے درمیان، انسان اور سانپ کے درمیان دُوری اور بُعد کی دیوار کھڑی کر دیتے ہیں۔ اس کے متضاد محبت سے قربت کا احساس وجود میں آتا ہے۔ اللہ، بھگوان، نروان، گاڈ (GOD)، ایل ایلیا، ماورا ہستی ہر خاص و عام کی سرپرست ہے، نگراں ہے، ابتدا ہے اور انتہا ہے۔ خوف نگراں ذات سے بندہ کو عمیق سمندر میں پھینک دیتا ہے۔ محبت سے قربت کا احساس جنم لیتا ہے۔ ماورا ہستی اللہ سے جتنی محبت کی جائے وہ ہستی اسی مناسبت سے دس گنا بندے کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔ دوستی کا وصف قربت ہے نہ کہ دُوری۔ دوست کو دوست سے نہ خوف ہوتا ہے اور نہ غم۔ آدم اور حوّا کے بیٹوں اور بیٹیوں کو عہد کرنا چاہیئے کہ ماورا ہستی اللہ سے آج کے بعد ڈریں گے نہیں، اس سے محبت کریں گے اس لئے کہ ماورا ہستی خود اعلان کر رہی ہے کہ "اللہ کے دوستوں کو نہ خوف ہوتا ہے اور نہ غم ہوتا ہے۔"

(۱۷) آدم کو مٹی سے بنایا ہے تو ہر آدمی مٹی سے بنا ہے اور ہم مٹی کو مٹی میں دفن کر دیتے ہیں۔ ایک حسین مورتی جس کے حسن پر سبھی لوگ جان دیتے ہیں اور والہ و شیدا بنے رہتے ہیں اصل میں مٹی کے ذرات سے مرکب ہے۔ محبت کی شراب پینے والے جس پیالے میں شراب پیتے ہیں وہ پیالہ اسی مٹی سے بنتا ہے۔ قدرت کی کرشمہ سازی بھی کیا خوب ہے کہ ایک ہی مٹی سے مختلف شکلیں بناتی رہتی ہے۔ اور پھر اسی مٹی میں ملا کر مٹا دیتی ہے۔ اور پھر بنا دیتی ہے۔ تخلیق کے اس عمل میں واضح نشانیاں ہیں جو فی الواقع خالق کائنات کو جاننا اور پہچاننا چاہتے ہیں۔ آدم کی افتادِ طبع بھی عجیب ہے کہ اس نے چمک دمک رکھنے والی شراب کی نہروں کو جنت میں ویران چھوڑا، قسم قسم کے پھولوں اور باغوں میں پرندوں کی چہکار کو بھی خیر باد کہہ دیا۔ آدم کسی ایک بات یا ایک چیز پر قانع نہیں رہتا۔ اس کا جنت میں رہتے رہتے جب جی گھبرانے لگا تو اسے چھوڑ کر زمین پر آگیا اس کے مزاج میں ہر آن اور ہر لحظہ تغیر اور تبدل ہے۔

(۱۸) بندے کے اوپر اللہ کا یہ حق ہے کہ بندے کو اللہ کی ذات اور صفات کی معرفت حاصل ہو۔ اس کا دل اللہ کی محبت سے سرشار ہو۔ اس کے اندر عبادت کا ذوق اور اللہ کے عرفان کا تجسس کروٹیں لیتا ہو۔ بندے کا اللہ کے ساتھ اس طرح تعلق استوار ہو جائے کہ بندگی کا ذوق اس کی رگ رگ میں رچ بس جائے اور بندہ اپنے پورے ہوش و حواس کے ساتھ جان لے کہ میرا اللہ کے ساتھ ایک ایسا رشتہ ہے جو کسی آن، کسی لمحے اور کسی دقیقے میں نہ ٹوٹ سکتا ہے نہ معطل ہو سکتا ہے نہ ختم ہو سکتا ہے۔ یہ بات بھی حقوق اللہ میں شامل ہے کہ بندہ اس بات سے باخبر ہو اور اس کا دل اس کی تصدیق کرے کہ میں نے عالم ارواح میں اس بات کا عہد کیا ہے کہ میرا رب مجھے بنانے والا، خدوخال بخش کر میری پرورش کرنے والا اور میرے لئے وسائل فراہم کرنے والا اللہ ہے اور میں نے اللہ سے اس بات کا عہد کیا ہے کہ میں زندگی خواہ کسی عالم میں ہو، آپ کا بندہ ہو کر گزاروں گا۔

(۱۹) کون کہتا ہے کہ دولت پرستی اور بت پرستی دو الگ الگ باتیں ہیں۔ پتھروں کو پوجنا یا سونے کو پوجنا ایک ہی بات ہے۔ بُت بھی پتھروں اور مٹی سے تخلیق کیے جاتے ہیں اور سونا چاندی بھی مٹی کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ سونے چاندی اور جواہرات کی محبت نے قوم کو اندھا کر دیا ہے۔ دولت کا ذخیرہ شرافت اور خاندان کا معیار بن گیا، ہوسِ زر نے انسانی قدریں پامال کر دیں۔ اخلاق، نجابت اور قومی روایات سب ملبے کا ڈھیر بن گئی ہیں۔ موت کے بعد زندگی پر سے یقین اٹھ گیا ہے۔ ساری قوم "بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کی تفسیر بن گئی۔ رُوحانی قدروں کو ذبح کر کے اخلاقی برائیوں کو جنم دیا جا رہا ہے۔ اللہ کے دوست جب اس کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں تو قوم کانوں میں روئی اور منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر بیٹھ جاتی ہے۔ قوم کے نیک باطن افراد آنسو بہاتے ہیں اور شیطان اپنی کامرانی پہ قہقہے لگاتا ہے۔

(۲۰) جسم کے تقاضوں کی طرح انسان کی رُوح میں بھی تقاضے ہوتے ہیں۔ رُوح کے تقاضے بھی انسانی شعور کو یہ احساس دلاتے ہیں کہ ان تقاضوں کی تکمیل ہونی چاہیئے۔ روحانی تقاضے اور ان کی تکمیل جسمانی تقاضوں سے زیادہ اہم اور نتیجہ خیز ہوتی ہیں۔ ان کے نتائج جسمانی تقاضوں کے مقابلے میں زیادہ مسلسل اور عظیم الشان ہوتے ہیں۔

روحانی تقاضوں میں سب سے اہم اور سب سے زیادہ بنیادی تقاضہ جو ہر انسان کے اندر پیدا ہوتا ہے وہ انسان کو احساس دلاتا ہے کہ اسے اپنے خالق سے رابطہ پیدا کرنا چاہیئے اور اسے ان خوشیوں اور مسرتوں سے بہرہ مند ہونا چاہیئے جو کہ اس رابطے اور قربت کا لازمی نتیجہ ہے۔ کہا گیا ہے کہ "اللہ کے دوستوں کو نہ خوف ہوتا ہے، نہ غم۔" (القرآن)

(۲۱) بُردباری، تحمل اور حکمت کی روش یہ ہے کہ آدمی درگزر سے کام لے اور اپنی بیوی کے ساتھ خوش دلی سے نباہ کرے۔ ہوسکتا ہے اللہ اس عورت کے ذریعے مرد کو ایسی بھلائیوں سے نواز دے جن تک مرد کی پہنچ نہ ہو۔ دیانتدار عورت اپنے ایمان، سیرت اور اخلاق کے باعث پورے خاندان کے لئے رحمت ہے۔ اس کی ذات سے کوئی ایسی سعید رُوح وجود میں آسکتی ہے جو ایک عالم کے لئے مشعلِ راہ بن جائے۔ اچھی اور نیک خصلت بیوی مرد کی اصلاحِ حال کے لئے ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ بیوی خاوند کو جنّت سے قریب کر دیتی ہے۔ اس کی قسمت سے دنیا میں خدا مرد کو رزق اور خوش حالی سے نوازتا ہے۔ عورت کے کسی ظاہری عیب کو دیکھ کر بے صبری کے ساتھ ازدواجی تعلق کو برباد نہ کیجئے بلکہ حکیمانہ طرزِ عمل سے آہستہ آہستہ گھر کی مکدّر فضا کو زیادہ سے زیادہ خوش گوار بنا لیجئے۔

(۲۲) انسانوں کے درمیان ابتدائے آفرینش سے بات کرنے کا طریقہ رائج ہے۔ آواز کی لہریں جن کے معنی معیّن کر لیئے جاتے ہیں سننے والوں کو مطلع کرتی ہیں۔ یہ طریقہ اس ہی تبادلہ کی نقل ہے جو انا کی لہروں کے درمیان ہوتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ گونگا آدمی اپنے ہونٹوں کی خفیف جنبش سے سب کچھ کہہ دیتا ہے اور سمجھنے کے اہل سب کچھ سمجھ جاتے ہیں۔ یہ طریقہ بھی پہلے طریقے کا عکس ہے۔ جانور آواز کے بغیر ایک دوسرے کو اپنے حال سے مطلع کر دیتے ہیں۔ یہاں بھی انا کی لہریں کام کرتی ہیں۔ درخت آپس میں گفتگو کرتے ہیں۔ یہ گفتگو صرف آمنے سامنے کے درختوں میں نہیں ہوتی بلکہ دور دراز کے ایسے درختوں میں بھی ہوتی ہے جو ہزاروں میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ یہی قانون جمادات میں بھی رائج ہے۔ کنکروں، پتھروں، مٹی کے ذرّوں میں من و عن اسی طرح تبادلۂ خیال ہوتا ہے۔

(٢٣) خواب ہماری زندگی کا نصف حصّہ ہے اور ہمیں بتاتا ہے کہ انسان کے اندر ایسے حواس بھی کام کرتے ہیں جن کے ذریعے انسان کے اوپر غیب کا انکشاف ہو جاتا ہے۔ خواب اور خواب کے حواس میں ہم ٹائم اور اسپیس کے ہاتھ میں کھلونا نہیں ہیں بلکہ ٹائم اور اسپیس ہمارے لئے کھلونا بنے ہوئے ہیں۔ خواب میں چونکہ اسپیس اور ٹائم (مکانیت اور زمانیت) کی جکڑبندیاں نہیں ہیں اس لئے ہم خواب میں ان حالات کا مشاہدہ کرتے ہیں جو زمان اور مکان سے ماوراء ہیں۔ آسمانی صحائف میں مستقبل کی نشاندہی کرنے والے خوابوں کا ایک سلسلہ ہے جو نوعِ انسانی کو تفکر کی دعوت دیتا ہے۔ قرآنِ پاک کے ارشاد کے مطابق خواب میں غیب کا انکشاف صرف انبیائے کرام علیہم السّلام کے لئے مخصوص نہیں بلکہ ہر انسان اللہ کے اس قانون سے فیض یاب ہے۔

(٢٤) شہباز کی قوتِ پرواز بھی مٹی کی ممنونِ کرم ہے کیوں کہ اس کے جسمانی اعضا اسی مٹی (کل رنگ روشنی) کی مختلف ترکیبوں سے وجود میں آئے ہیں۔ البتہ تخلیق کا اصل راز یہ ہے کہ مٹی کے اندر خالق کائنات کا امر متحرک ہے جو مٹی کو مختلف سانچوں میں ڈھال کر مختلف شکلوں میں ظاہر کر رہا ہے۔ کنکر، پتھر، پودے، مختلف قسم کے جانور اور انسان دراصل مختلف سانچے (DIES) ہیں۔

کائنات میں موجود جتنی اشیا ہیں ان سب کی تخلیق ڈائیوں (DIES) میں ہو رہی ہے جس طرح چڑیا کی ڈائی میں پلاسٹک ڈال کر چڑیا بنالی جاتی ہے اور کبوتر کی ڈائی میں پلاسٹک ڈال کر کبوتر بنا لیا جاتا ہے اسی طرح قدرت کی بنائی ہوئی ڈائیوں میں مصالحہ (MATTER) ایک خاص طریقۂ کار سے منتقل ہوتا رہتا ہے اور نئی نئی صورتیں وجود میں آتی رہتی ہیں۔

(۲۵) ہم جب اپنے آپ کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس ایک محدود اور فنا ہونے والا جسم ہے اور یہی ہماری زندگی کی پہچان ہے۔ یہ جسم جو ہمیں نظر آتا ہے اس کے اجزائے ترکیبی کثافت، گندگی، تعفن اور سڑاند ہیں۔ اس سڑاند کی بنیاد اس نظریے پر قائم ہے کہ ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ میں مادہ ہوں اور میں اس مادی دنیا کی پیدائش ہوں۔ یہ محدود نظریہ ہر آدمی کو کسی ایک مقام میں محدود کر دیتا ہے اور ہر آدمی ایک محدودیت کے تانے بانے میں خود کو گرفتار کر لیتا ہے اور اس طرح محدود اور پابند نظریے کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ زمین پر بسنے والا ہر آدمی جب اپنا تذکرہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں، میں ہندو ہوں، میں پارسی ہوں، میں عیسائی ہوں حالاں کہ روح کا کوئی نام نہیں رکھا جا سکتا۔ روشنی ہر جگہ روشنی ہے چاہے وہ عرب میں ہو، عجم میں ہو یا یورپ میں ہو یا ایشیا کے کسی حصّے میں۔

(۲۶) انسانی زندگی کے تمام دَور بشمول ماضی اور مستقبل لوحِ محفوظ پر نقش ہیں۔ کائنات کا ہر ذرّہ اس نقش کی تفصیلی تصویر ہے۔ ہر ذرّے کے وجود کی گہرائی میں اسی نقش کا سراغ ملتا ہے۔ اسی طرح پتھر میں پتھر کے زمانے کی ساری فلم موجود ہے۔ یہ فلم پتھر کے اندر جھانکنے سے نظر آتی ہے۔ اسی ریکارڈ یا فلم کا مشاہدہ کر کے روحانی آدمی ماضی اور مستقبل کے تمام واقعات سے مطلع ہو جاتا ہے۔ آدم کی تخلیق میں جو فارمولے کام کر رہے ہیں وہ ازل سے ایک ہی پیٹرن (PATTERN) یا طرز پر قائم ہیں۔ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ان کی مظاہراتی طرزوں میں تغیّر (VARIATION) تو رونما ہوتا رہتا ہے لیکن بنیادوں میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ انسانی طبیعت میں تقاضے، رنج و غضب، پیار، جنس وغیرہ یکساں ہیں۔ البتہ ہر دَور میں اُن کی مظاہراتی صورتیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔

۲۷ اللہ نے آدم کو اپنی نیابت عطا فرمائی تو فرشتوں نے عرض کیا کہ یہ زمین پر فساد پھیلائے گا۔ یہ بتانے کے لئے کہ آدم کے اندر شر اور فساد کے ساتھ خیر و فلاح کا سمندر بھی موجزن ہے، اللہ نے آدم سے کہا کہ ہماری تخلیقی صفات بیان کرو۔ جب آدم نے تخلیقی صفات اور تخلیق میں کام کرنے والے فارمولے (اسمائے الٰہیہ) بیان کیئے تو فرشتے برملا پکار اٹھے "پاک اور مقدس ہے آپ کی ذات، ہم کچھ نہیں جانتے مگر جس قدر علم آپ نے ہمیں بخش دیا ہے، بے شک و شبہ آپ ہی کی ذات علیم اور حکیم ہے۔" تفکر کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ فرشتوں نے جو کچھ کہا اللہ نے اس کی تردید نہیں کی۔ بات کچھ یوں بنی کہ آدم کی اولاد کو جب تک اللہ کی صفات کا علم منتقل نہیں ہوتا وہ سرتاپا شر اور فساد ہے اور تخلیق کا علم منتقل ہونے کے بعد وہ سراپا خیر ہے۔

۲۸ جن حواس سے ہم کشش ثقل میں مقید چیزوں کو دیکھتے ہیں اس کا نام شعور ہے اور جن حواس میں ہم کشش ثقل سے آزاد ہو جاتے ہیں اس کا نام لاشعور ہے۔ شعور اور لاشعور دونوں لہروں پر قیام پذیر ہیں۔ شعوری حواس میں کام کرنے والی لہریں مثلث (TRIANGLE) ہوتی ہیں اور لاشعوری حواس میں کام کرنے والی لہریں دائرہ (CIRCLE) ہوتی ہیں۔

شعوری حواس میں ہم ٹائم اسپیس (TIME + SPACE) میں بند ہیں اور لاشعوری حواس ہمیں ٹائم اسپیس سے آزاد کر دیتے ہیں۔ یہ دونوں حواس ایک ورق کی طرح ہیں۔ ورق کے دونوں صفحات پر ایک ہی تحریر لکھی ہوئی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ورق کے ایک صفحہ پر عبارت ہمیں روشن اور واضح نظر آتی ہے اور ورق کے دوسرے صفحہ پر دھندلی اور غیر واضح نظر آتی ہے۔

(۲۹) غیب مظاہر سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ غیب کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ مذہب یا دین جس چیز کو کہتے ہیں وہ دراصل غیب کی نشاندہی ہے۔ مذہب میں مظاہر کا تذکرہ ضرور آتا ہے لیکن اس کو کسی بھی دور میں اوّلیت حاصل نہیں ہوئی، اس لئے کہ مادّی ہر چیز فنا کے راستے پر گامزن ہے جب کہ خود راستہ بھی فانی ہے۔ ایک خدا کا پرستار جس طرح غیب پر ایمان رکھتا ہے بالکل اسی طرح ایک مادّے کا پرستار مادّیت کی دنیا پر یقین رکھتا ہے۔ نہ خدا پرست کو غیب کی دنیا پر ایمان رکھے بغیر چارہ ہے اور نہ مادّیت پرست کو مادّے پر ایمان لائے بغیر مفر ہے۔ دونوں اپنی ایک طرز رکھتے ہیں اور ان میں یہ چیز مشترک ہے کہ اس طرز پر ان کا ایمان اور ایقان ہوتا ہے۔ اسی ایمان اور ایقان کو یہ زندگی کہتے ہیں۔ کوئی زندگی ایمان و ایقان کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ وہ زندگی خدا پرست کی زندگی ہو یا مادّہ پرست کی ہو۔

(۳۰) وہم کیا ہے؟ خیال کہاں سے آتا ہے؟ یہ بات غور طلب ہے۔ اگر ان سوالات کو نظر انداز کر دیں تو کثیر حقائق مخفی رہ جائیں گے اور حقائق کی زنجیر جس کی سوفی صد کڑیاں اس مسئلے کے سمجھنے پر منحصر ہیں، انجانی رہ جائیں گی۔ جب ذہن میں کوئی خیال آتا ہے تو اس کا کوئی کائناتی سبب ضرور ہوتا ہے۔ خیال کا آنا اس بات کی دلیل ہے کہ ذہن کے پردوں میں حرکت ہوئی ہے۔ یہ حرکت ذہن کی ذاتی حرکت نہیں ہوتی۔ اس کا تعلق کائنات کے ان تاروں سے ہے جو کائنات کے نظام کو ایک خاص ترتیب میں حرکت دیتے ہیں۔ مثلاً جب ہوا کا کوئی تیز جھونکا آتا ہے تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ کرۂ ہوائی میں کہیں کوئی تغیّر پیدا ہوا ہے۔ اسی طرح جب انسان کے ذہن میں کوئی چیز وارد ہوتی ہے تو اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ انسان کے لاشعور میں کوئی حرکت واقع ہوئی ہے۔ اس کا سمجھنا خود انسانی ذہن کی تلاش پر ہے۔

(۳۱) دنیا میں رائج علوم کی اگر درجہ بندی کی جائے تو ہم انہیں تین حصّوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ طبیعیات (PHYSICS)، نفسیات (PSYCHOLOGY) اور مابعدُالنفسیات (PARA-PSYCHOLOGY) علمِ طبیعیات کے ضمن میں زندگی کے وہ اعمال واشغال آتے ہیں جن سے کوئی آدمی محدود دائرے میں رہ کر مستفیض ہوتا ہے یعنی اس سوچ کا محور مادّہ (MATTER) ہوتا ہے۔ مادّی دنیا کے اس خول سے وہ باہر نہیں نکل سکتا۔ نفسیات وہ علم ہے جو طبیعیات کے پسِ پردہ کام کرتا ہے۔ خیالات و تصوّرات اور احساسات کا تانا بانا اس علم سے مرکب ہے۔ علم مابعد النفسیات علم کی اس بساط کا نام ہے جس کو روحانیت میں مصدرِ اطلاعات (SOURCE OF INFORMATION) کہا جاتا ہے علمی حیثیت میں یہ ایک ایسی ایجنسی ہے جو لاشعور کے پسِ پردہ کام کرتی ہے۔

(۳۲) کہا جاتا ہے کہ انسانوں کو زندہ رہنے کے لئے کسی نہ کسی عقیدے کا پابند رہنا ضروری ہے۔ گردوپیش کے حالات اور ماں باپ کی تربیت سے جس قسم کے عقائد بچّے کے ذہن میں پرورش پاجاتے ہیں وہی بچّے کا مذہب بن جاتا ہے۔ تمام نظریات کی بنیاد اسی اصول پر کارفرما ہے۔ اس کے بغیر تاثرات، واردات اور کیفیات کو عقیدے کے سلسلے میں کوئی جگہ نہیں ملتی۔ ہمارے تمام فلسفے اور تمام طبعی سائنس اسی کلیّہ پر قائم ہیں لیکن ہم جب انسان کی ذہنی اور اندرونی زندگی پر غور کرتے ہیں تو ہمیں ذاتی اور باطنی واردات وکیفیات میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ اور ہم یہ اقرار کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ زندگی کا بہت تھوڑا سا حصّہ عقلیت کی گرفت میں آتا ہے۔ جو کچھ ہے سب بچپن میں سُنی ہوئی، دیکھی ہوئی اور والدین سے ورثہ میں ملی ہوئی کیفیات کا ثمر ہے۔

(۳۳) لوحِ محفوظ سے ایک نور آتا ہے جو پوری کائنات میں پھیلتا ہے

اس میں ہر قسم کی اطلاعات ہوتی ہیں جو کائنات کے ذرّے ذرّے کو ملتی ہیں۔ ان اطلاعات میں چکھنا، سونگھنا، سُننا، دیکھنا، محسوس کرنا، خیال کرنا، وہم و گمان وغیرہ اور زندگی کا ہر شعبہ، ہر حرکت، ہر کیفیت کامل طرزوں کے ساتھ موجود ہوتی ہے۔ ان کو صحیح حالت میں وصول کرنے کا طریقہ صرف ایک ہے۔ انسان ہر معاملہ میں، ہر حالت میں کامل استغنا رکھتا ہو۔ مسخ کرنے والی اس کی اپنی مصلحتیں ہوتی ہیں۔ جہاں مصلحت نہیں ہے وہاں استغنا ہے، غیر جانبداری ہے اور اللہ کا شعار ہے۔ روحانیت کے راستے پر سفر کرنے والے سالکین کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ روحانیت میں اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا مقصد، کوئی دوسری غایت شریک کرنا کفر ہے۔

(۳۴) قلندر بابا اولیاءؒ فرماتے ہیں:۔

ساری کائنات میں ایک ہی لاشعور کارفرما ہے۔ اس کے ذریعے غیب و شہود کی ہر لہر دوسری لہر کے معنی سمجھتی ہے چاہے یہ دونوں لہریں کائنات کے دو کناروں پر واقع ہوں۔ غیب و شہود کی فراست اور معنویت کائنات کی رگِ جاں ہے۔ ہم اس رگِ جاں میں جو خود ہماری رگِ جاں بھی ہے تفکر اور توجہ کر کے اپنے سیارے اور دوسرے سیاروں کے آثار و احوال کا انکشاف کر سکتے ہیں۔ انسانوں اور حیوانوں کے تصورات، جنّات اور فرشتوں کی حرکات و سکنات، نباتات و جمادات کی اندرونی تحریکات معلوم کر سکتے ہیں۔ مسلسل توجہ دینے سے ذہن کائناتی لاشعور میں تحلیل ہو جاتا ہے اور ہمارے سراپا کا معین پرت اَنا کی گرفت سے آزاد ہو کر ضرورت کے مطابق ہر چیز دیکھتا، سمجھتا اور شعور میں محفوظ کر دیتا ہے۔

(۳۵) فضاؤں میں رنگینی، زندگی کو تحفظ دینے والی روشنیاں، طرح طرح کی گیسیں، نیلگوں آسمان کی بساط پر ستاروں کی انجمنیں، رات کی تاریکی میں روشن چاند، دن کے اُجالے کو جِلا بخشنے والا سُورج، ہوا، معطّر خراماں نسیمِ سحر، درختوں کی نغمہ سرائی، چڑیوں کی چہکار، بلبل کی صدا، کوئل کی کُوک کس نے تخلیق کی ہے؟ سیلابوں کی گزرگاہیں اور بجلی کی گرج اور چمک کی راہیں کس نے مقرر کیں؟ کیا تو بادلوں کو پکار سکتا ہے کہ وہ تجھ پر مینہ برسائیں، کیا تو بجلیوں کو اپنے حضور بلا سکتا ہے؟ دل میں سمجھ اور فہم کس نے عطا کی ہے اور ہرن کو آزادی کس نے دی؟ اگر ان باتوں کو قدرت و عظمت سے تعبیر کر کے اپنی بے بضاعتی کہا جائے تو خود ہمارے جسم میں ایسی بے شمار نشانیاں موجود ہیں جن سے ہم ہرگز ہرگز صرفِ نظر نہیں کر سکتے کہ ساری کائنات عقل والوں کے لئے ایک نشانی ہے۔ ہے کوئی سمجھنے والا؟

(۳۶) جب سے ہوش سنبھالا ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ ہم صرف دعاؤں کے ذریعے اپنے مسائل حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم عمومی اور خصوصی دعائیں بھی مانگتے ہیں۔ آدھی صدی یا دو تہائی سے زیادہ کا زمانہ گزر چکا ہے میں نے من حیث القوم کافروں کے اوپر فتح و کامرانی کی کوئی دعا قبول ہوتے نہیں دیکھی۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ دعائیں اس لئے قبول نہیں ہوتیں کہ ان کے ساتھ عمل نہیں ہے اور تخلیق کا راز یہ ہے کہ عمل بجائے خود ایک تخلیق ہے۔ جب سے ہم نے عمل کو ترک کیا ہے اور صرف دعاؤں کا سہارا لینا شروع کیا ہے ہمارے اندر سے نور نکل گیا ہے اور نار نے ہمیں اپنا لقمۂ تر سمجھ لیا ہے۔ اے واعظو! اے منبر نشینو! اے قوم کے دانشورو! برائے خدا سوئی قوم کو جگاؤ اور بتاؤ کہ بے عمل قومیں مفلوج، مغضوب اور غلام بن جاتی ہیں۔

(۴۷) قرآنِ پاک میں جتنی جگہ نماز کا تذکرہ ہوا ہے وہاں قائم کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ یہ نہیں کہا ہے کہ نماز پڑھو۔ نماز پڑھنے اور قائم کرنے میں فرق ہے۔ "نماز خواندن" آتش پرستوں کے یہاں رائج ہے۔ جب وہ اپنی کتاب "ژندو اوستا" پڑھ کر آگ کے سامنے جھکتے ہیں، اس کو نماز خواندن یعنی نماز پڑھنا کہتے ہیں۔ عربی سے جب اُردو زبان میں ترجمہ کیا گیا تو یہ سہو ہوا کہ "صلوٰۃ قائم کرو" کا ترجمہ "نماز پڑھنا" کر دیا گیا حالانکہ قرآنِ پاک کے ارشاد کے مطابق صلوٰۃ کا ترجمہ صلوٰۃ ہی ہونا چاہیئے تھا جس طرح کلمہ طیبہ کا ترجمہ کلمہ طیبہ ہے، اللہ کا ترجمہ اللہ ہے، رحمان کا ترجمہ رحمان ہے، پیغمبر کا ترجمہ پیغمبر ہے، رسُول کا ترجمہ رسُول ہے۔ قرآن کے ارشاد کے مطابق "قائم کرو صلوٰۃ" اور اُردو ترجمہ کے مطابق "نماز پڑھو" کے معنی و مفہوم میں بہت بڑا فرق واقع ہو گیا ہے۔

(۴۸) "سُود لینے والے، سُود دینے والے اور سُودی معیشت میں زندہ رہنے والے اللہ کے ایسے دشمن ہیں جو اللہ کے ساتھ حالتِ جنگ میں ہیں۔"

تمام مسلمان نمازیں بھی پڑھتے ہیں، روزے بھی رکھتے ہیں، حج بھی کرتے ہیں، زکوٰۃ بھی دیتے ہیں۔ عقل دست بہ گریباں ہے کہ اللہ کے دشمنوں کی نماز نماز کس طرح ہوگی۔ اللہ کے ساتھ حالتِ جنگ میں رہتے ہوئے روزے کی برکتیں اور سعادتیں کیسے حاصل ہوں گی۔ جن لوگوں کو اللہ نے اپنا دشمن قرار دے دیا ہے وہ کس منہ سے خانۂ کعبہ کا طواف کرتے ہیں اور خانۂ کعبہ کے انوار و تجلّیات سے اللہ کے دشمن کیوں کر منوّر ہو سکتے ہیں؟ تاریخ ایک عظیم گواہ ہے کہ جس قوم نے اللہ کے بنائے ہوئے قانون کا مذاق اڑایا، اللہ نے اس قوم کو ذلیل اور پست کر دیا۔ کیا ابھی بھی وقت نہیں آیا کہ ہم اپنے ظاہر اور باطن کا محاسبہ کریں؟

(۳۹) ظاہری جسم کی طرح انسان کے اُوپر ایک اور جسم ہے جو گوشت کے جسم کے اوپر ہمہ وقت موجود رہتا ہے۔ اس جسم کو جسم مثالی (AURA) کہتے ہیں۔ مادّی گوشت پوست کے جسم کا دار و مدار اس ہی جسم کے اوپر ہے اور یہ جسم روشنیوں کا بنا ہوا ہے۔ روشنیوں کا بنا ہوا جسم صحت مند ہے تو گوشت پوست کا جسم بھی صحت مند رہتا ہے۔ زندگی کے اندر جتنے تقاضے موجود ہیں وہ تقاضے گوشت کے جسم میں پیدا نہیں ہوتے بلکہ روشنیوں سے بنے ہوئے جسم میں پیدا ہوتے ہیں اور وہاں سے منتقل ہو کر گوشت پوست کے جسم کے اوپر ظاہر ہوتے ہیں۔ جب آدمی روٹی کھاتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ مادّی جسم روٹی کھا رہا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ جب تک جسم مثالی کے اندر بھوک کا تقاضا پیدا نہیں ہو گا اور جسم مثالی گوشت پوست کے جسم کو بھوک یا پیاس سے مطلع نہیں کرے گا آدمی روٹی نہیں کھا سکتا۔

(۴۰) خوابوں کے ذریعے انسان کو ان حادثات سے محفوظ رہنے کے لئے اشارات ملتے رہتے ہیں جو مستقبل میں پیش آنے والے ہوتے ہیں اور ان احتیاطی تدابیر کو اختیار کر کے ان حادثات سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ بعض اوقات غیر ارادی طور پر بیداری میں انسان کی چھٹی حس اسے آنے والے حادثات سے خبردار کر دیتی ہے۔ اس قسم کے بہت سارے واقعات لوگوں کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ ان سب کی توجیہ ایک ہی ہے کہ ذہن ایک لمحے کے لئے زمانِ شعور سے نکل کر لاشعور کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے اور آنے والے واقعہ کو محسوس کر لیتا ہے لیکن یہ بیشتر غیر ارادی طور پر واقع ہوتی ہے۔ اگر اس واردات پر مراقبہ کے ذریعے غلبہ حاصل کر کے ارادے کے ساتھ وابستہ کر لیا جائے تو بیداری کی حالت میں بھی مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کا مطالعہ اور مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

(۴۱) هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ

مفہوم : یہ کتاب ان لوگوں کو روشنی دکھاتی ہے جو اپنے اور اللہ کے بارے میں ذوق رکھتے ہیں۔ (سورۂ بقرہ)

غیب سے مراد وہ حقائق ہیں جو انسان کے مشاہدات سے باہر ہیں۔ وہ سب کے سب اللہ کی معرفت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایمان سے مراد یقین۔ یقین وہ حقیقت ہے جو تلاش میں سرگرداں رہتی ہے اس لئے نہیں کہ اُسے کوئی معاوضہ ملے گا بلکہ صرف اس لئے کہ طبیعت کا تقاضا پورا کرے۔ متقی سے مراد وہ انسان ہے جو سمجھنے میں بڑی احتیاط سے کام لیتا ہے، ساتھ ہی بدگمانی کو راہ نہیں دیتا۔ وہ اللہ کے معاملے میں اتنا محتاط ہوتا ہے کہ کائنات کا کوئی رُوپ اُسے دھوکا نہیں دے سکتا۔ وہ اللہ کو بالکل الگ سے پہچانتا ہے اور اللہ کے کاموں کو بالکل الگ سے جانتا ہے۔

(۴۲) "اور آپ کیا سمجھے اعلیٰ زندگی کیا ہے اور آپ کیا سمجھے اسفل زندگی کیا ہے۔ یہ ایک ریکارڈ ہے۔" علمِ حقیقت یا رُوحانی علم ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ اگر ہم خود سے اور اپنے خالق سے متعارف ہونا چاہتے ہیں تو ہمارے اوپر لازم ہے کہ ہم اپنے ماضی میں جھانکیں۔ ماں کے پیٹ میں آنے سے پہلے بچہ عالمِ برزخ میں تھا۔ عالمِ برزخ لوحِ محفوظ کا ایک عکس ہے۔ لوحِ محفوظ کتاب المبین کا ایک ورق ہے۔ کتاب المبین عالمِ اَرواح ہے اور عالمِ اَرواح وہ عالم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب "کُن" کہا تھا تو اس کا ظہور ہو گیا تھا۔ مرنے کے بعد کی زندگی دراصل اسی عالمِ اَرواح کی طرف پیش قدمی ہے۔ نوعِ انسان کے جو افراد اس زندگی کو دیکھنے، سمجھنے اور تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق ان کو ایسی نظر اور بصیرت مل جاتی ہے جو اس عالم کو دیکھ لیتی ہے، سمجھ لیتی ہے۔

(۴۳) زندگی گزارنے کی ایک طرز یہ ہے کہ آدم زاد ہمہ وقت، ہر آن اور ہر لمحہ پابند حواس کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔ زندگی گزارنے کی دوسری طرز یہ ہے کہ آدم زاد پابند حواس کے ساتھ بھی آزاد زندگی گزارتا ہے۔ حزن اور ملال کے تاثرات اسے متاثر نہیں کرتے۔ زمین کے اُوپر وسائل کی چکاچوند اس کی آنکھوں کو خیرہ نہیں کرتی، اس لئے کہ زمین سے دُور بہت دُور اعلیٰ زمین "جنّت" اُس کی نگاہوں کے سامنے ہوتی ہے۔ جس طرح مادّیت میں قید وہ یہاں روٹی کھاتا ہے اسی طرح مادّیت سے آزاد ہو کر جنّت کے باغات سے انگور کے خوشے حاصل کرنا اس کے لئے آسان ہے۔ جب کوئی شخص خود شناسی میں مکمّل ہو جاتا ہے تو اس کے اُوپر زندگی کی نئی راہ، نئی طرز اور نیا اُسلُوب منکشف ہوتا ہے۔ ایسے شخص کو قلندر شعور کا حامل مردِ آزاد کہا جاتا ہے۔

(۴۴) بُری باتوں اور گالم گلوچ سے زبان گندی نہ کیجئے، چغلی نہ کھایئے چغلی کرنا ایسا ہے کہ جیسے کوئی بھائی اپنے بھائی کا گوشت کھاتا ہو۔ دوسروں کی نقلیں نہ اُتاریئے۔ اس عمل سے دماغ میں کثافت اور تاریکی پیدا ہوتی ہے۔ شکایتیں نہ کیجئے کہ شکایت محبّت کی قینچی ہے۔ کسی کی ہنسی نہ اڑایئے کہ اس سے آدمی احساسِ برتری میں مبتلا ہو جاتا ہے اور احساسِ برتری آدمی کے لئے ایسی ہلاکت ہے جس ہلاکت میں ابلیس مبتلا ہے۔ اپنی بڑائی نہ جتایئے۔ اس عمل سے اچھے لوگ آپ سے دُور ہو جائیں گے۔ خوشامدی اور چاپلوسی کرنے والے منافق آپ کا گھیراؤ کریں گے اور ایک روز آپ عرش سے فرش پر گر جائیں گے۔ فقرے نہ کسیئے، کسی پر طنز نہ کیجئے، بات بات پر قسم نہ کھایئے۔ یہ عمل آپ کے کردار کو گہنا دے گا اور آپ لوگوں کی محبت سے محرُوم ہو جائیں گے۔

(۴۵) ایمان ایک ایسا جوہر ہے جس کی چاشنی اور حلاوت دنیا کی ہر چیز سے زیادہ ہے مگر یہ حلاوت اور چاشنی اسی بندے کو حاصل ہوتی ہے جو دنیا کی ہر چیز سے زیادہ اللہ کو محبوب رکھتا ہے۔ وہ بندہ جو اللہ سے زیادہ دوسری چیزوں کو عزیز رکھتا ہے، اللہ کا سچا بندہ نہیں ہے۔ جب ہم محبت کا تذکرہ کرتے ہیں تو محبت ہم سے کچھ تقاضے کرتی ہے اور وہ تقاضا یہ ہے کہ محبت ہمیشہ قربانی چاہتی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ محبت ایک ایسی قلبی کیفیت کا نام ہے جو ظاہرا آنکھوں سے نظر نہیں آتی لیکن انسان کا عمل اس بات کی شہادت فراہم کرتا ہے کہ اس کے اندر محبت کا سمندر موجزن ہے یا نہیں۔ ایک آدمی زبانی طور پر اگر اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ میں اپنے محبوب سے محبت کرتا ہوں لیکن جب ایثار اور قربانی کا وقت آتا ہے تو وہ اپنے قول میں سچا ثابت نہیں ہوتا، بلاشبہ اس کی محبت قابلِ تسلیم نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴۶) موجودہ سائنس تلاش اور جستجو کے راستے پر چل کر اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ پوری کائنات ایک ہی قوت کا مظاہرہ ہے۔ یہ انکشاف نیا نہیں ہے۔ ہمارے اسلاف میں کتنے ہی لوگ اس بات کو بیان کر چکے ہیں کہ آدمی کی تصویر مختلف النوع خیالات کے رنگوں سے مرکب ہے۔ خیال ہمیں مسرت آگیں زندگی سے ہم کنار کرتا ہے اور یہی خیال ہمیں غمناک زندگی سے آشنا کر دیتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سائنس ترقی کے عروج پر پہنچ گئی ہے لیکن آج کے سائنس داں وہی کہہ رہے ہیں جو ہزاروں سال پہلے روحانیت کے علم بردار کہہ چکے ہیں۔ اور جس کا پرچار آج بھی ان کے پیروکار حضرات کا مشن ہے وہ یہ کہ زندگی کا قیام مادہ پر نہیں لہروں پر ہے اور لہریں خیالات کا جامہ پہن کر ہر شے کا وجود بن رہی ہیں۔ مادے سے بنی ہوئی تصویروں میں ہمیں جو کچھ نظر آتا ہے وہ فریبِ نظر کے سوا کچھ نہیں ہے۔

(۴۷) ہم بحیثیت بزرگ بار بار اعلان کرتے ہیں کہ نوجوان نسل کے ذہنوں سے بزرگوں کا احترام اُٹھ گیا ہے۔ ان کے اندر وہ اخوت وحیا نہیں رہی جس کے اُوپر مثالی معاشرہ تعمیر کیا جاتا ہے۔ خدارا اپنے گریبان میں مُنہ ڈالیئے یہ بھی دیکھئے کہ ہمارے قول و فعل میں کتنا تضاد واقع ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود کہ ہم اپنا اختیار استعمال کر کے اس منافقانہ زندگی کو بدل سکتے ہیں، ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں۔ ہم جو خود نہیں کرتے اس کی توقع اپنی اولاد سے کیوں کرتے ہیں۔ آج اگر ایک باپ جھوٹ کی ملمع شدہ زندگی میں قید ہے تو وہ اولاد سے کیوں کر توقع کر سکتا ہے کہ وہ سچی اور حق آشنا زندگی گزارے گا۔ بچے ماں کے پیٹ سے قاتل، چور، ذخیرہ اندوز، منافق، اسمگلر پیدا نہیں ہوتے۔ انہوں نے اپنے بزرگوں کو جو کچھ کرتے دیکھا ہے، ترقی دے کر اُسے فن بنا دیا ہے۔

(۴۸) زندگی کا قیام سانس کے اوپر ہے۔ جب تک سانس کی آمد و شد جاری ہے زندگی رواں دواں ہے اور جب سانس میں تعطل واقع ہو جاتا ہے تو بظاہر اعتبار سے زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ سانس اندر جاتا ہے اور باہر آتا ہے۔ روحانی نقطۂ نظر سے سانس کا اندر جانا انسان کو اس کی رُوح یا INNER سے قریب کر دیتا ہے اور سانس کا باہر آنا انسان کو اس کی رُوح سے عارضی طور پر دُور کر دیتا ہے۔ جب ہم سانس اندر لیتے ہیں تو ازل سے قریب تر ہو جاتے ہیں اور جب سانس باہر نکالتے ہیں تو خود کو ازل سے دُور محسوس کرتے ہیں یعنی سانس کا باہر آنا مادی اور ازل کی زندگی کے درمیان ایک پردہ ہے۔ جب ہم سانس کو اندر روکتے ہیں تو ہمارا رشتہ ازل سے قائم ہو جاتا ہے اور جب سانس باہر نکالتے ہیں تو ہمارا رشتہ ساری دنیا سے قائم ہو جاتا ہے۔

(۴۹) کوئی چہرہ ہمارے سامنے ایسا آتا ہے کہ ہم اس چہرے کو دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں۔ اور کوئی چہرہ ہمارے سامنے ایسا بھی آتا ہے کہ ہم اس چہرے میں سے نکلنے والی لہروں سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ جن لوگوں کے دل نُور سے معمور ہوتے ہیں اور جن لوگوں کے دماغ میں خلوص، ایثار، محبت، پاکیزگی اور خدمتِ خلق کا جذبہ ہوتا ہے ایسے لوگوں کے چہرے بھی خوش نما، معصوم اور پاکیزہ ہوتے ہیں۔ ان چہروں میں ایسی مقناطیسیت ہوتی ہے کہ ہر شخص قریب ہونا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس ایسے لوگ جو احساسِ گناہ اور اضطراب میں مبتلا ہیں ان کے چہروں پر خشونت، خشکی، یبوست، بے آہنگی اور کراہت کے تاثرات پیدا ہو جاتے ہیں اور یہ تاثرات دوسرے آدمی کے دل میں دور رہنے کا تقاضا پیدا کرتے ہیں۔

(۵۰) ہر زمانے میں عقل مندوں نے ہوسِ زر کی مخالفت کی ہے۔ قرآن نے اسے "حطمہ" کہا ہے جس کی آگ ستون کی مانند دل پر چڑھ جاتی ہے اور آدمی کو بھسم کر ڈالتی ہے۔ جو دولت حطمہ نہیں ہے وہ روشن سورج، تاروں بھری رات، چاند کی ٹھنڈک، عطر بیز ہوائیں اور ایک پُرسکون دل ہے۔ ایسے ہی صاحبِ دل لوگ جن کو اطمینانِ قلب نصیب ہوتا ہے اور اُن کی تخلیقی سوچ اللہ کی سوچ ہوتی ہے۔ انہیں سب میں اللہ کا نور نظر آتا ہے۔ ان کی زندگی ایسے روشن اور پاکیزہ خیالات کا مرقع ہے جن میں کوئی کثافت نہیں ہوتی۔ لالچ اور گمراہی کے عقوبت خانوں کے دروازے ان کے اوپر بند ہو جاتے ہیں۔ ان کی زندگی میں ایسی حلاوت ہوتی ہے جیسی حلاوت شیر خوار بچے کو ماں کی گود میں ملتی ہے۔

۵۱ جن قوموں سے ہم مرعوب ہیں اور جن قوموں کے ہم دست نگر ہیں اُن کی طرزِ فکر کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سورج کی طرح روشن ہے کہ سائنس کی ساری ترقی کا زور اس بات پر ہے کہ ایک قوم اقتدار حاصل کرے اور ساری نوعِ انسانی اس کی غلام بن جائے یا ایجادات سے اتنے مالی وسائل پیدا کئے جائیں کہ ایک قوم یا ایک مخصوص ملک مالدار ہو جائے اور نوعِ انسانی غریب اور مفلوک الحال بن جائے کیوں کہ اس ترقی میں نوعِ انسانی کی فلاح مضمر نہیں ہے۔ اس لئے یہ ساری ترقی نوعِ انسانی کے لئے اور خود ان قوموں کے لئے جنہوں نے جدوجہد اور کوشش کے بعد نئی نئی ایجادات کی ہیں مصیبت اور پریشانی بن گئی ہے۔ مصیبت اور پریشانی ایک روز ادبار بن کر زمین کو جہنم بنا دے گی۔

پانی کا قطرہ سمندر سے اٹھا تو بادل بن گیا۔ وہاں سے ریگستانوں میں ٹپکا تو دوبارہ فضا میں اُڑ گیا۔ باغ میں برسا تو اوس بن کر پھلوں میں جا پہنچا۔ وہاں سے پیٹ میں آیا اور یہاں آیا تو جزوِ جسم بن کر قائم رہا یا جسم میں سے پھر باہر نکل گیا اور اگر دوبارہ سمندر میں جائے گا تو گویا وطن پہنچ گیا۔ الغرض قطرۂ آب کسی نہ کسی رنگ میں موجود رہتا ہے۔ اگر پانی مرکب ہونے کے باوجود زندہ رہتا ہے تو رُوح کو جو بسیط ہے بدرجۂ اَولیٰ باقی رہنا چاہیئے۔ جس طرح آفتابی شعاعیں پیاسے ریگستان میں ٹپکے ہوئے قطروں کو ڈھونڈ کر آسمانی بلندیوں کی طرف واپس لے جاتی ہیں اسی طرح زندگی کے یہ تمام قطرے جو اجسامِ انسان کے خاک دانوں میں ٹپک پڑتے ہیں لامکانی وسعتوں میں دوبارہ پہنچ جاتے ہیں۔

(۵۳) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ خدا کے بندوں میں کچھ ایسے ہیں جو نبی اور شہید تو نہیں ہیں لیکن قیامت کے روز خدا ان کو ایسے مرتبوں پر سرفراز فرمائے گا کہ انبیاء اور شہداء بھی ان کے مرتبوں پر رشک کریں گے۔ صحابہ نے پوچھا "وہ کون خوش نصیب ہوں گے یارسولؐ اللہ!" آپؐ نے فرمایا "یہ وہ لوگ ہیں جو آپس میں ایک دوسرے سے محض خدا کے لئے محبت کرتے تھے۔ نہ یہ آپس میں رشتہ دار تھے اور نہ ان کے درمیان کوئی لین دین تھا۔ خدا کی قسم! قیامت کے روز اُن کے چہرے نُور سے جگمگا رہے ہوں گے۔ جب سارے لوگ خوف سے کانپ رہے ہوں گے تو انہیں کوئی خوف نہ ہوگا اور جب سارے لوگ غم میں مبتلا ہوں گے اس وقت انہیں قطعاً کوئی غم نہ ہوگا۔

(۵۴) آج کی ترقی یافتہ دنیا میں بے شمار ایجادات اور لامتناہی آرام و آسائش کے باوجود ہر شخص بے سکون، پریشان اور عدم تحفظ کا شکار ہے۔ سائنس چونکہ MATTER پر یقین رکھتی ہے اور مادّہ یا MATTER عارضی اور فکشن ہے۔ اس لئے سائنس کی ہر ترقی، ہر ایجاد اور آرام و آسائش کے تمام وسائل عارضی اور فنا ہو جانے والے ہیں۔ جس شے کی بنیاد ہی ٹوٹ پھوٹ اور فنا ہو اس سے کبھی حقیقی مسرت حاصل نہیں ہو سکتی۔ مذہب اور لامذہب میں یہ بنیادی فرق ہے کہ لامذہبیت انسان کے اندر شکوک و شبہات، وسوسے اور غیر یقینی احساسات کو جنم دیتی ہے جب کہ مذہب تمام احساسات، خیالات، تصوّرات اور زندگی کے اعمال و حرکات کو ایک قائم بالذّات اور مستقل ہستی سے وابستہ کر دیتا ہے۔

(۵۵) اے واعظ! میں جس آقا کا غلام ہوں ان کا ارشاد ہے "قلم لکھ کر خشک ہوگیا۔" آج میری پیشانی پر جو قلم زندگی کی رقصاں ہے وہ میری پیدائش سے پہلے ہی ازل میں بن گئی تھی اور یہی میری تقدیر ہے۔ اے واعظ! تیرے وعظ و نصیحت کا میرے اوپر کیا اثر ہوگا۔ تو خود ازل کی لکھی ہوئی تحریر ہے۔ یہ سب بادہ و جام کی باتیں بھی ازل میں ہی لکھی جا چکی ہیں۔ یہ شراب (زندگی) اور یہ جام (خاکی لباس سے مزین جسم) قدرت کی ایسی لکیر ہے جسے کوئی بھی نہیں بدل سکتا۔ اے واعظ! یہ سعادتِ ازلی سعادت مندوں کو میسر آتی ہے۔ ازلی شقی اس کے قرب سے محروم رہتے ہیں۔ بالآخر ایک وقت آئے گا کہ یہ لکیریں (لہریں) منتشر ہو جائیں گی۔ گراویٹی (GRAVITY) کا عمل ختم ہو جائے گا اور جسم تحلیل ہو جائے گا۔

(۵۶) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی دولت جمع نہیں کی۔ حضورؐ اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ کا عمل یہ تھا کہ ایران و روم کی دولت کے انبار اُن کے سامنے تھے لیکن یہ قدسی نفس حضرات چھپن لاکھ مربع میل قلمرو پر حکومت کرنے کے باوجود مزدوری کر کے بچوں کا پیٹ پالتے تھے اور مزدوری سے جو کچھ بچتا تھا وہ خیرات کر دیتے تھے۔ دنیا میں دولت سے زیادہ بے وفا کوئی چیز نہیں ہے۔ دولت نے کبھی کسی کے ساتھ وفا نہیں کی۔ دولت ہرجائی ہے۔ دولت ایک ایسا بزدلانہ تشخص ہے کہ جو دولت کو پوجتا ہے دولت اس کو تباہ و برباد کر دیتی ہے لیکن جو بندہ دولت کی تحقیر کرتا ہے، سر پر رکھنے کے بجائے دولت کو پیروں کی خاک سمجھتا ہے دولت اس کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہے۔

(۵۷) آج کے دُور کو ترقی کی معراج کا دُور کہا جاتا ہے۔ اس معراج کا تجزیہ کرنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ترقی کے معانی ظلم و ستم کا ختم نہ ہونے والا لامتناہی سلسلہ ہے۔ ترقی یہ ہے کہ بھوکے ننگے انسانوں کو ترقی کا فریب دے کر ان کے اوپر اپنی علمی برتری کی دہشت بٹھا دی جائے۔ دھرتی ماتا اپنے بچوں کے لئے جن وسائل کو جنم دیتی ہے انہیں ہڑپ کر کے ہلاکت خیز ہتھیار بنائے جائیں بھوک اور افلاس زدہ لوگوں سے کھربوں ڈالر چھین کر ایٹم بم بنایا جائے جو لاکھوں آدمیوں کو ایک لمحہ میں لقمۂ اجل بنا کر نگل لے اور پھر اس درندگی کی تشہیر کر کے اللہ کی مخلوق کو اس قابل بھی نہ رہنے دیا جائے کہ وہ اپنی بقا کے لئے کچھ سوچ سکے اور اپنی نسل کی حفاظت کے لئے کچھ کر سکے۔

(۵۸) آج ہم جانتے ہیں کہ ہم سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تہذیبیں اسی زمین پر ظاہر ہوئیں اور اس طرح معدوم ہو گئیں کہ صرف آثار باقی رہ گئے۔ جب ہم ان عوامل کا کھوج لگاتے ہیں جو اُن کی مکمل تباہی میں کارفرما ہیں تو ہمارے سامنے یہ بات کھل کر آتی ہے کہ جن قوموں کا رشتہ دنیا سے مستحکم اور اپنی رُوح سے کمزور ہو گیا بالآخر اُن کے اوپر حرص اور لالچ غالب آ گیا۔ ایسی قوموں کا مقصدِ زندگی صرف اور صرف دنیا کا حصول بن جاتا ہے اور کبھی نہ ختم ہونے والی حرص و ہوس کی دوڑ میں پورا معاشرہ اس طرح گرفتارِ بلا ہو جاتا ہے کہ کوئی صورت باہر نکلنے کی باقی نہیں رہ جاتی تو قومیں تباہ و برباد کر دی جاتی ہیں یا پھر اُن کے چہرے مسخ ہو جاتے ہیں۔

(۵۹) کتنی عجیب بات ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے ساری زندگی اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے سامانِ دنیا اپنے گرد اکٹھا کیا، ان کے مرنے کے بعد لوگوں نے ان کے نام بھی فراموش کر دیئے۔ دوسری طرف وہ پاکیزہ نفس لوگ ہیں جن کے ذکر پر آج بھی پیشانیاں عقیدت و محبت کے جذبات سے جُھک جاتی ہیں جب تک یہ لوگ عوام میں موجود رہے حق کی شمع بن کر فروزاں رہے اور جب پسِ پردہ چلے گئے تب بھی ان کا تشخص لوگوں کے سامنے موجود رہا اس لئے کہ انہوں نے ذاتی غرض اور خود پسندی کو بالائے طاق رکھ دیا تھا، مایا جال ان کو اپنی گرفت میں نہیں لے سکا۔ ان سعید رُوحوں نے یہ راز جان لیا تھا کہ خود سے گزرے بغیر خدا نہیں مل سکتا۔

(۶۰) "اور آپ کے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم خدا کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔"

محسن کی شکر گزاری اور احسان مندی شرافت کا اوّلین تقاضا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ہمارے وجود کا محسوس سبب "ماں باپ" ہیں جن کی پرورش اور نگرانی میں ہم پلتے، بڑھتے اور شعور کو پہنچتے ہیں۔ اور جس غیر معمولی قربانی، بے مثال جانفشانی اور انتہائی شفقت و ایثار سے وہ اولاد کی دیکھ بھال اور تربیت کرتے ہیں حق یہ ہے کہ ہمارا دل ان کی عقیدت و احسان مندی اور عظمت و محبت سے سرشار ہو اور ہمارے جسم کا رُواں رُواں اُن کا شکر گزار ہو۔ اللہ نے اپنی شکر گزاری کے ساتھ ساتھ والدین کی شکر گزاری کی تاکید کی ہے۔

(۶۱) گرجا گھر، آتش کدہ اور مسجد کا وجود یا ان میں اور ان کے ماننے والوں میں اختلاف اور واعظ کے وعظ میں دوزخ کے عذاب سے ڈرانے کا عمل آخر کب تک جاری رہے گا۔ اے کاش! ان لوگوں پر قدرت کے وہ راز کھل جائیں جو خالق نے اپنے خاص بندوں کو بتا دیئے ہیں۔ جن لوگوں کی پیشانی روشن تھی اور ماتھے پر سجدے کا نشان تھا اور ان کے چہرے چمک دمک سے معمور تھے، جب انہیں مٹی میں دفن کیا گیا تو مٹی نے انہیں بھی مٹی ہی بنا دیا۔ کیسے کیسے چاند اور سورج اس زمین میں دفن ہو چکے ہیں۔ ہم ان کا شمار بھی نہیں کر سکتے۔ چند دنوں کی اس عارضی دنیا میں جو آدمی کبر و نخوت کی تصویر بنا پھرتا ہے، بالآخر اسے بھی موت مٹی کے ذروں میں تبدیل کر دے گی اور لوگ مٹی کے یہ ذرے اپنے پیروں میں روندتے پھریں گے۔

(۶۲) خالقِ کائنات نے اس دنیا کو محبت، خوشی، مسرت و شادمانی اور ایثار کا گہوارہ بنایا تھا اور آج بھی دنیا کی ہر شے دیدۂ بینا کو مسرت اور خوشی مہیا کرتی ہے۔ خوبصورت خوبصورت رنگ برنگ چڑیاں، فطرت کے شاہد مناظر، پانی کا اتار چڑھاؤ، پہاڑوں کی بلندی، آسمان کی رفعت، پھولوں کا حسن، درختوں کی قطاریں، تاروں بھری رات، روشن روشن دن، ماں کی آنکھوں میں محبت کی چمک، بچے کا مچلنا، اور کلکاری بھرنا، بہن کی پاکیزگی، بھائی کا اخلاص، بیٹی کا تقدس، باپ کی شفقت یہ سب بلاشبہ نوعِ انسانی کے لئے خوشی اور شادمانی کا سامان ہیں۔ ایک ماں کی طرح زمین بھی یہی چاہتی ہے کہ اس کی اولاد پُرمسرت زندگی گزارے، زمین کو دوزخ نہ بنا ڈالے، اس کے اوپر پھولوں کی بجائے انگاروں کی کاشت نہ کی جائے۔

(٦٣) ایک انسان دوسرے انسان میں اپنے ارادے اور اختیار سے جذب ہو جاتا ہے لیکن سنٹی میٹر کے ہزارویں حصے کے برابر خلا نہ ہونے کے باوجود دونوں انسان الگ الگ رہتے ہیں، خود کو الگ الگ محسوس کرتے ہیں۔ قانون یہ بنا کہ مقداروں میں تعین ہی انفرادیت قائم کرتا ہے۔ کوئی انسان اس تخلیقی قانون کو توڑ نہیں سکتا۔ جس طرح ایک انسان ادراک رکھتا ہے، اسی طرح مال و زر اور دولت بھی ادراک رکھتی ہے۔ جب کوئی انسان دولت کے تشخص سے فرار اختیار کرتا ہے تو مقداروں کے قانون کے مطابق توازن برقرار رکھنے کے لئے دولت اس کے پیچھے بھاگتی ہے اور جب کوئی انسان دولت کے پیچھے بھاگتا ہے تو دولت اس کے ساتھ بے وفائی کرتی ہے اور عذاب بن کر اس کے اوپر مسلّط ہو جاتی ہے۔

(٦٤) آبادی میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں ہے جو بیمار ہونا یا مرنا چاہتا ہے اگر زندہ رہنا اختیاری ہوتا تو دنیا میں کوئی آدمی موت سے ہم آغوش نہ ہوتا۔ علیٰ ہٰذالقیاس زندگی کے بنیادی عوامل اور وہ تمام حرکات جن پر زندگی رواں دواں ہے انسان کے لئے اختیاری نہیں ہے۔ اگر ہم بنیاد پر غور کریں تو زندگی اس وقت شروع ہوتی ہے جب آدمی پیدا ہوتا ہے جب کہ پیدائش پر انسان کو کوئی اختیار نہیں ہے۔ لاکھوں سال کے طویل عرصے میں ایک فرد بھی ایسا نہیں ہے جو اپنے ارادے اور اختیار سے پیدا ہو گیا ہو۔ پیدا ہونے والا ہر فرد ایک وقت معیّنہ کے لئے اس دنیا میں آتا ہے اور جب وہ وقت پورا ہو جاتا ہے تو آدمی ایک سیکنڈ کے لئے بھی اس دنیا میں مزید قیام نہیں کر سکتا۔

(٦٥) قرآن کہتا ہے "زمین و آسمان میں اہلِ ایمان کے لئے حقائق و بصائر موجود ہیں"۔ یعنی اہلِ ایمان کی خصوصیت یہ ہے کہ زمین و آسمان کی حقیقتوں اور زمین و آسمان کے اندر موجود تخلیقات کے فارمولوں (EQUATIONS) پر اُن کی گہری نظر ہوتی ہے۔ اُن کے مشاہدے کی طاقت کہکشانی نظاموں کی نقاب کشائی کرتی ہے۔ قرآن بار بار یہ اعلان کرتا ہے کہ یہ نشانیاں ایمان والوں کے لئے ہیں مفہوم یہ ہے کہ نشانیاں تو سب کے لئے ہیں مگر انسانوں میں صرف ایمان والے لوگ ہی اللہ کی نشانیوں، آیتوں اور حکمتوں پر غور و فکر کرتے ہیں۔ غفلت اور جہالت میں ڈوبے ہوئے لوگ جو جانوروں کی طرح جیتے ہیں، ضدّی اور ہٹ دھرم جو "میں نہ مانوں" کی زندہ متحرک تصویر ہیں اُن کے لئے اللہ کی نشانیوں کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے۔

(٦٦) ہر آدمی جو ذرا بھی شعور رکھتا ہے ہر وقت اس بات کا مشاہدہ کرتا ہے کہ زندگی کا ہر لمحہ مر رہا ہے۔ ایک لمحہ مرتا ہے تو دوسرا لمحہ پیدا ہوتا ہے۔ دن مرتا ہے تو رات پیدا ہوتی ہے۔ بچپن مرتا ہے تو لڑکپن پیدا ہوتا ہے، لڑکپن مرتا ہے تو جوانی پیدا ہوتی ہے اور جوانی مرتی ہے تو بڑھاپا پیدا ہوتا ہے اور جب بڑھاپا مرتا ہے تو خوبصورت مورتی کا ایک ایک عضو مٹی کے ذرات میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہڈیاں جس کے اوپر انسانی ڈھانچے کا دار و مدار ہے راکھ بن جاتی ہیں، دماغ جس پر انسانی عظمت کا دار و مدار ہے اور جس دماغ کے اُوپر انسان اکڑتا ہے، دوسروں کے اوپر ظلم کرتا ہے، خود کو خدا کہنے لگتا ہے اس کو بھی مٹی کھا جاتی ہے اور مٹی کے ذرات کے بنے ہوئے اس جیسے دوسرے انسان اس دماغ کو اپنے پیروں تلے روندتے ہیں۔

(۶۷) علم حضوری کے علاوہ کوئی علم حقیقی نہیں اس لئے کہ یہ علم الٰہی ہے انسان کا حافظہ اتنی وسعت نہیں رکھتا کہ علم حضوری کی کسی ایک طرز کو بھی اپنے اندر محفوظ کرلے۔ چنانچہ لوح محفوظ سے پھیلنے والا نور انسان کو اطلاعات فراہم کرتا ہے تو اپنی غرض اور مطلب برآری کے نقطۂ نظر سے کام لے کر ان اطلاعات کو نو سو ننانوے (۹۹۹) فی ہزار تو رد کر دیتا ہے، ایک فی ہزار کو مسخ کرکے، توڑ مروڑ کے حافظہ میں رکھ لیتا ہے۔ یہی مسخ شدہ اور بگڑے ہوئے خدوخال اس کے تجربات کا، مشاہدات کا، عادات و حرکات کا سانچا بن جاتے ہیں۔ یہ ہے انسان کا تمام کارنامہ اور اس کی معین کردہ اور فرض کردہ سمتیں، فارمولے اور اصول۔ اس ہی خرافات کے بارے میں وہ بار بار یہ کہتا رہتا ہے کہ یہ ہے میرا تجربہ، یہ ہے مشاہدہ، یہ ہے علم طبعی۔

(۶۸) زندگی کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ہم ایسی چیز کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں جس میں مسرت کا پہلو نمایاں ہو۔ چوں کہ ہم غم زدہ اور پُر مسرت زندگی گزارنے کے قانون سے ناواقف ہیں اس لئے زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ ہم مسرت کی تلاش میں اکثر و بیشتر غلط سمت قدم بڑھاتے رہتے ہیں اور ناواقفیت کی بنا پر اپنے لیے ایسا راستہ منتخب کر لیتے ہیں جس میں تاریکی، بے سکونی اور پریشانیوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ وہ کون سا راستہ ہے جس راستے میں مسرت کی روشن قندیلیں اپنی روشنی بکھیر رہی ہیں۔ وہ کون سی فضا ہے جس میں شبنم موتی بن جاتی ہے۔ وہ کون سا ماحول ہے جو معطر اور پُرسکون ہے۔ وہ کون سی خوشبو ہے جس سے شعور روشن ہو جاتا ہے۔

(۶۹) دنیا میں ہر وقت اللہ کے ایسے بندے موجود رہتے ہیں جو شہود اور باطنی نعمتوں سے مالا مال ہوتے ہیں۔ جب وہ دنیا میں اکثریت کے عمل کا تجزیہ کرتے ہیں تو انہیں یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ لوگ چند روزہ زندگی کو اصل زندگی سمجھے ہوئے ہیں لیکن جلد ہی اس کی وجہ بھی ان کی نظر میں آجاتی ہے اور وہ بے ساختہ پکار اُٹھتے ہیں کہ سچ تو یہ ہے کہ بے خودی خودی سے اور موت زندگی سے اعلیٰ تر ہے لیکن دنیا کے باسیوں پر عدم کا یہ راز روشن نہیں ہے کہ اصل زندگی وہی ہے جو مرنے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ اس مخفی راز کی وجہ سے ہی دنیا میں آدم کی دلچسپی قائم ہے۔ اگر آدم زاد پر دنیا کی بے ثباتی روشن ہو جائے تو عارضی زندگی اور دنیا سے دل اُچاٹ ہو جائے گا۔

(۷۰) ہر انسان کے اندر سطحی اور گہری سوچ موجود ہے۔ تفکر جب گہرا ہوتا ہے تو بجز اس کے کوئی بات سامنے نہیں آتی کہ ہر آدمی جنّت اور دوزخ اپنے ساتھ لئے پھرتا ہے اور اس کا تعلق طرزِ فکر سے ہے۔ طرزِ فکر آزاد اور انبیاء کے مطابق ہے تو آدمی کی ساری زندگی جنت ہے۔ طرزِ فکر میں ابلیسیت ہے تو تمام زندگی دوزخ ہے۔

(۷۱) نسلی اعتبار سے ہمارے بچے جس مذہب کے پیروکار ہیں انہیں اس مذہب میں سکون نہیں ملتا تو وہ بغاوت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ سکون ایک ایسی حقیقت ہے جس کے ساتھ پوری کائنات بندھی ہوئی ہے۔ حقیقت فکشن نہیں ہوتی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ بندے کے اندر وہ کون سی طاقت ہے جو ٹوٹ پھوٹ، گھٹنے بڑھنے اور فنا ہونے سے محفوظ ہے۔ وہ طاقت، وہ ہستی ہر بندے کی اس کی اپنی رُوح ہے نسلی اعتبار سے اگر ہم اپنے بچوں کو ان کے اندر موجود رُوح سے آشنا کر دیں تو وہ خدا کے دوست بن جائیں گے۔ زندگی کی ذہنی، جسمانی اور رُوحانی تمام مسرّتیں ان کو مل جائیں گی۔

(۷۲) شگوفے اور خار، پھول اور کانٹے اپنی ذات میں ایک محسوساتی ردِّ عمل ہیں۔ ردِّ عمل طرزِ فکر کی نشاندہی کرتا ہے۔ طرزِ فکر میں ایمان، یقین، مشاہدہ موجود ہے تو آدم کی اولاد سکون آشنا ہے۔ طرزِ فکر میں بے یقینی، شک اور کور چشمی ہے تو زندگی کانٹوں بھری ایک سیج ہے، ہر کروٹ لہولہو اور ہر سانس فنا ہے۔

(۷۳) دنیا میں جتنے عظیم لوگ پیدا ہوئے ہیں وہ کبھی کسی نہ کسی مسئلہ سے دوچار رہے ہیں لیکن وہ اس نکتہ سے باخبر ہوتے ہیں کہ مسائل اس وقت تک مسائل ہیں جب تک انسان ذہنی سکون کی زندگی سے ناآشنا ہے۔ ان لوگوں کے اوپر سے مسائل و تکالیف کی گرفت ٹوٹ جاتی ہے جو اللہ کی مخلوق کی خدمت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیتے ہیں۔ کسی ایسے شخص کی خدمت کیجئے جو نادار ہے، ضرورت مند ہے۔ پھر دیکھیئے کہ آپ کو کتنا سکون ملتا ہے۔ دوسروں کی مدد کرنا اور اُن کے کام آنا انسانیت کی معراج ہے اور یہی وہ مشن ہے جس کو عام کرنے کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر دنیا میں تشریف لائے۔

(۷۴) جسمانی خوشیاں اور غم عارضی ہیں۔ یہ اس لئے کہ مادی جسم فانی ہے جسم فنا ہوتا ہے تو جسم سے متعلق ہر حرکت فنا ہو جاتی ہے۔ رُوح لافانی ہے۔ اس لئے ہر وہ چیز جو رُوح سے متعلق ہے لافانی ہے۔ رُوحانی آگہی کی تکمیل کے نتیجے میں جو خوشی حاصل ہوتی ہے وہ ہمیشہ کی مسرت اور آرام کی ضامن ہے۔

(۷۵) اللہ نے انسان کو اپنا نائب بنایا ہے۔ اس کے اندر اپنی صفات کا علم پھونکا ہے۔ اس کو اپنی صورت پر تخلیق کیا ہے۔ نائب کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ اگر ایک مملکت کا صدر اپنے اختیارات کو استعمال کرنے میں کاغذ قلم کا محتاج نہ ہو تو اس کا نائب اختیارات استعمال کرنے میں کاغذ قلم کا محتاج ہو۔ اللہ وسائل کی محتاجی کے بغیر حاکم ہے تو اس کا نائب بھی وسائل کا دست نگر نہیں ہوتا۔ جس طرح خدا نے "کُن" کہہ کر کائنات کو وجود بخشا ہے، خدا کا نائب بھی اپنے ذہن کو حرکت دے کر خدا کی تخلیق میں تصرف کر سکتا ہے کیوں کہ اللہ کا نائب اس بات سے واقف ہوتا ہے کہ کائنات میں موجود تمام مظاہر ایک ہی ذات سے ہم رشتہ ہیں۔

(۷۶) آپ کی رفیقۂ حیات یا آپ کا رفیق سفر اگر دینی اور دنیاوی علوم سے بہرہ ور ہے تو دونوں بچوں کی بہترین تربیت کر سکتے ہیں۔ بچے کا پہلا گہوارہ ماں کی آغوش اور باپ کی گود ہے۔ دونوں اگر اسلامی اخلاق سے آراستہ ہوں گے تو بچوں کی تربیت اور سدھار کے لئے گھر تعلیم و تربیت کا پہلا اسکول بن جائے گا۔

(٧٧) اولیاء اللہ کی گفتگو اسرار و رموز اور علم و عرفان سے پُر ہوتی ہے اور ان کی زبان سے نکلا ہوا کوئی لفظ معرفت و حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ ان کے ملفوظات اور واردات رُوحانیت کے راستے پر چلنے والے سالکین کے لئے مشعلِ راہ ہوتے ہیں۔ اُن کی گفتگو اور ان کے الفاظ پر ذہنی مرکزیت کے ساتھ تفکر کیا جائے تو کائنات کی ایسی مخفی حقیقتیں منکشف ہوتی ہیں جن کا انکشاف اور مشاہدہ انسان کو اس امانت سے روشناس کر دیتا ہے جس کو سماوات، ارض، جبال نے یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ ہم اس امانت کے متحمل نہیں ہو سکتے' اگر ہم نے یہ امانت اپنے کندھوں پر اُٹھالی تو ہم ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔

(٧٨) اگر ہم کسی شخص سے قربت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں بھی وہی کرنا ہوگا جو ہمارا مطلوب کرتا ہے۔ اگر ہم اللہ تعالےٰ سے دوستی اور قربت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں بھی وہی کرنا ہوگا جو اللہ کرتا ہے اور اللہ ہر وقت اور ہر آن اپنی مخلوق کی خدمت میں مشغول ہے۔

(٧٩) جہاں تک طویل انتظار کا تعلق ہے، کائنات کے تخلیقی فارمولوں پر اگر غور کیا جائے تو یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہر گزرنے والا لمحہ آنے والے لمحات کے انتظار کا پیش خیمہ ہے، انتظار بجائے خود زندگی ہے۔ بچپن سے لڑکپن، لڑکپن سے جوانی اور جوانی بڑھاپے کے انتظار میں گزرتی ہے۔ اگر آج پیدا ہونے والے بچے کی زندگی میں آنے والے ساٹھ سالوں پر محیط بڑھاپا چھپا ہوا نہ ہو تو پیدا ہونے والا بچہ پنگوڑے سے باہر نہیں آئے گا، نشو و نما رُک جائے گی، کائنات ٹھہر جائے گی، چاند سورج اپنی روشنی سے محروم ہو جائیں گے۔ جب ہم زمین میں کوئی بیج ڈالتے ہیں تو یہ دراصل اس انتظار کے عمل کی شروعات ہے کہ یہ بیج پھول کھلائے گا۔

(٨٠) اللہ کی شانِ کریمی ہے کہ جب آسمان پر پرندوں کا غول دانہ چُگنے کے لئے اپنے پنجوں اور گردن کو کششِ ثقل کے تابع کرتے ہوئے زمین کی طرف آتا ہے تو اس سے پہلے کہ زمین پر پیر لگے اُن کی غذائی ضروریات تخلیق ہو جاتی ہیں۔ اربوں کھربوں پرندے روزانہ اپنی غذا حاصل کر لیتے ہیں۔

(۸۱) ماں باپ اولاد کی تمنا کرتے ہیں اور ماں مہینوں ایک نئی زندگی کو اپنے وجود میں پروان چڑھاتی ہے۔ پیدائش کے بعد بھی اولاد اور ماں کا رشتہ نہیں ٹوٹتا اور ماں ہر وقت اولاد کی خدمت پر کمربستہ رہتی ہے۔ خود دن رات تکلیفیں اٹھاتی ہے لیکن اولاد کے آرام و آسائش میں کمی نہیں آنے دیتی۔ اولاد کو ذرا سی تکلیف میں دیکھتی ہے تو بے چین ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف باپ رزق کے حصول کے لئے صبح نکلتا ہے اور شام کو گھر میں داخل ہوتا ہے۔ اپنی پوری توانائی سے اولاد کے لئے سامانِ خورد و نوش کا انتظام کرتا ہے۔ یہی وہ عظیم احسانات ہیں جن کی وجہ سے اولاد کے اوپر والدین کے حقوق عائد ہوتے ہیں۔

(۸۲) قرآن سائنسی فارمولوں کی ایک دستاویز ہے۔ اس کی مقدس آیات میں تفکر کیا جائے تو ہم خلائی تسخیر میں ایک ایسا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جہاں سائنس داں کھربوں ڈالر خرچ کر کے بھی نہیں پہنچ سکے ہیں۔ قرآن پاک کے ارشاد کے مطابق تسخیرِ کائنات ہمارا ورثہ ہے۔

(۸۳) اے آدم زاد! تیرے لیے قدرت اتنی رحیم و کریم ہے کہ اُس نے ہر موڑ پر تیرے لیے معافی کے دروازے کھول دیئے اور تجھے اپنے دامنِ عافیت میں لینے کے لیے قلندروں کا ایک سلسلہ قائم کیا۔ اے کاش! تو سوچتا کہ تو نے کیا کھویا ہے کیا پایا ہے۔ اے آدم و حوّا کی نافرمان اولاد! تو نافرمانی کے گندے تالاب میں غرقِ آب ہے جہاں دنیا اور دین کا ایسا خسارہ ہے جو انسانی بدنصیبی کا مکروہ داغ ہے۔ آؤ اپنی اس میراث کو تلاش کریں جس کے متحمل سماوات اور ارض اور پہاڑ بھی نہ ہو سکے، وہ میراث جس کے سامنے آسمان، زمین، ستارے، شمس و قمر سب مسخر ہیں۔ یہ امانت مادے کے خول سے ماورا ہماری رُوح کے اندر موجود ہے۔

(۸۴) اللہ کہتا ہے میں چھپا ہوا خزانہ تھا، پس میں نے محبت کے ساتھ مخلوق کو پیدا کیا تاکہ میں پہچانا جاؤں۔ محلِ نظر یہ بات ہے کہ اللہ خود کہتا ہے "میں نے محبت کے ساتھ تخلیق کیا ہے۔" یعنی اللہ کو پہچاننے کا واحد ذریعہ محبت ہے اور اللہ سے دُور کرنے والا جذبہ محبت کے برعکس نفرت ہے۔

(۸۵) جنّت کے باسی وہ لوگ ہیں جن کے سروں پر اللہ نے اپنا دستِ شفقت رکھ دیا ہے۔ جن لوگوں پر اللہ نے اپنا دستِ شفقت رکھ دیا ہے وہ اللہ کے دوست ہیں۔ اللہ خوف، غم، پریشانی سے بے نیاز ہے۔ اس لئے اللہ کے دوست میں اللہ کی صفت کا عکس نمایاں ہو جاتا ہے اور اُسے نہ خوف ہوتا ہے، نہ غم ہوتا ہے اور جو لوگ اللہ کے دوست نہیں ہیں جنت کی فضا انہیں کبھی قبول نہیں کرے گی۔ وہ دوزخ کا ایندھن ہوں گے۔ اگر کسی کے اندر خوف اور غم ہے تو وہ اللہ کے بیان کردہ قانون کے مطابق اللہ کا دوست نہیں ہے۔ اور جو بندہ اللہ کا دوست نہیں ہے جنت اُسے رد کر دیتی ہے۔

(۸۶) انسان کے وجود میں ایک وجود (مادّی جسم) پر ہر لمحہ اور ہر آن موت وارد ہوتی رہتی ہے۔ جس لمحہ موت وارد ہوتی ہے اس ہی لمحہ ایک نیا وجود تشکیل پا جاتا ہے۔ یہ وجود لمحہ بہ لمحہ حیات ہے۔ دوسرا وجود (روح) وہ ہے جس پر لمحات، گھنٹے، دن اور ماہ و سال اثر انداز نہیں ہوتے۔

(۸۷) یہ دنیا دوئی کی دنیا ہے۔ دنیا کا کوئی کردار بھی اس دُوئی سے آزاد نہیں ہے۔ موسم کا گرم و سرد میں تبدیل ہونا، خوشی کے اوپر غم کا سایہ اور غم کے اُوپر خوشی کا غلبہ، عزت لمحہ بھر بعد بے عزّتی، صحت بیماری، محبت نفرت، رات کا دن میں سے نکلنا اور دن کا رات میں داخل ہونا۔ یہ سب دوئیاں دراصل ہر کردار کے متضاد پہلو ہیں۔ دوئی کی دنیا میں جب تک اس تضاد کو نہیں سمجھا جائے گا کسی چیز کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔

ہر انسان پیدائش سے لے کر بڑھاپے تک تجربات کی ایک دستاویز ہے۔ دستاویز میں بھلائی سرایت کر گئی تو دستاویز قیمتی اور فائدہ مند ہے۔ رگ و پے میں برائی رچ بس گئی ہے تو دستاویز بھونڈی اور بھیانک ہے۔

(۸۸) یہ ساری دنیا ایک لمحہ میں قید ہے اور اس ایک لمحاتی دنیا کے اصول کے مطابق آدم کو ایک گھڑی مستعار ملی ہے۔ اگر یہ زندگی محض بے کار باتوں میں گزر گئی تو ساری دنیا ہی گزر گئی۔ ہم نہ پیدا ہوئے، نہ جئے، نہ اُٹھے، نہ بیٹھے، نہ کچھ کیا، نہ کچھ سمجھا۔ گویا ایسے آئے کہ آئے ہی نہ تھے۔

۸۹ انسان ایک چکر فی سیکنڈ کی آواز کی لہروں کو محسوس کرسکتا ہے۔ لیکن ایک ہزار چکر فی سیکنڈ سے زیادہ چکر کی آواز کی لہروں کو انسانی کان سُن نہیں سکتے۔ اس کے برعکس کتے، بلیاں اور لومڑیاں ساٹھ ہزار چکر فی سیکنڈ کی آوازیں سُن سکتی ہیں۔ چوہے، چمگادڑ، وھیل اور ڈولفن ایک لاکھ چکر فی سیکنڈ کی آوازیں سُن سکتے ہیں۔ مچھلیاں بھی سمندر میں انتہائی مدھم ارتعاش کو محسوس کرلیتی ہیں۔

انسان میں دیکھنے کی حد (RANGE) بہت کم ہوتی ہے جب کہ شہد کی مکھی ماورائے بنفشی شعاعیں (ULTRAVIOLET RAYS) دیکھ سکتی ہے۔ انسان کے مقابلے میں شاہین کی آنکھ کسی چیز کو آٹھ گنا بڑا دیکھتی ہے۔

۹۰ اچھے یا بُرے عمل کی پہچان یہ ہے کہ ایک عمل کرنے سے ضمیر خوش ہوتا ہے اور اس کے اندر سکون و اطمینان کی لہریں موجزن ہوجاتی ہیں۔ اور عمل کی دوسری پہچان یہ ہے کہ ضمیر ناخوش ہوتا ہے اور انسان یہ عمل کرکے ندامت محسوس کرتا ہے۔

۹۱ آگ کے شعلے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک طرح کے شعلوں سے ہر چیز خاکستر ہوجاتی ہے اور دوسری طرح کے شعلوں سے ہر چیز کے اندر زندگی دوڑنے لگتی ہے۔ آدم زاد جب خیر کی روشنیوں سے اپنی آبیاری کرتا ہے تو یہ بھڑکتے شعلے گل و گلزار بن جاتے ہیں اور آدم زاد جب شر کے خمیر سے اپنی آبیاری کرتا ہے تو یہ شعلے اُسے جہنم کی آگ میں دھکیل دیتے ہیں۔ خیر و شر کیا ہے؟ طرزِ فکر کے دو نام ہیں۔ طرزِ فکر میں اگر بندگی اور اللہ کے ساتھ محبت ہے تو یہ خیر ہے۔ طرزِ فکر میں اگر غیر اللہ کی محبت ہے تو یہ شر ہے۔ خیر قائم بالذّات جل جلالہٗ اور شر قائم بالشیطان ہے۔ خیر کی تعریف یہ ہے کہ اللہ اسے پسند کرتا ہے، اس کے برعکس شر یہ ہے کہ اللہ اُسے پسند نہیں کرتا۔

۹۲ ریاکار، دھوکے باز اور مطلب پرست شخص کے اندر منافقت پیدا ہوجاتی ہے اور اس کے اندر وسوسوں کا عفریت داخل ہوجاتا ہے جس کے نتیجے میں آدم زاد جو فرشتوں کا مسجود ہے اپنی ذات سے ناآشنا ہو کر دوسروں کا محکوم بن جاتا ہے۔

(۹۳) زاہدانہ زندگی یہ نہیں ہے کہ آدمی خواہشات کو فنا کر کے خود فنا ہو جائے۔ آدمی اچھا لباس پہننا ترک کر دے، پھٹا پرانا اور پیوند لگا لباس پہننا ہی زندگی کا اعلیٰ معیار قرار دے لے تو دنیا کے سارے کارخانے اور تمام چھوٹی بڑی فیکٹریاں بند ہو جائیں گی۔ اور لاکھوں کروڑوں لوگ بھوک زدہ ہو کر ہڈیوں کا پنجر بن جائیں گے۔ اللہ نے زمین کی کوکھ سے وسائل اس لئے نہیں نکالے کہ ان کی بے قدری کی جائے، ان کو استعمال نہ کیا جائے۔ اگر روکھا سوکھا کھانا ہی زندگی کی معراج ہے تو بارشوں کی کیا ضرورت ہے۔ اللہ نے رنگ رنگ پھولوں، پتوں، درختوں، پھلوں، کوہساروں اور آبشاروں سے زمین کو زینت بخشی ہے۔

(۹۴) اے خدا! تیرے میکدے میں یہ کیسی بیداد ہے کہ سارے مہینے روزے رکھنے کے بعد بھی ہمیں معرفت کی شراب نہیں ملی جب کہ خود تیرا کہنا ہے کہ "روزے کی جزا میں خود ہوں"۔ جب اس مہینے میں بھی تیرا دیدار نصیب نہیں ہوا، کیا سارے سال مصیبتوں کی آندھیاں میرا مقدر نہیں بن جائیں گی؟

(۹۵) حیوانات کی نوع میں بے شمار دوسری نوعوں کی طرح ایک نوع آدمی بھی ہے لیکن جب کسی بندے کا تعلق اللہ تعالیٰ سے قائم ہو جاتا ہے تو وہ جانوروں کے گروہ سے نکل کر انسان بن جاتا ہے اور انسانوں کی فہم و فکر یہ ہوتی ہے کہ وہ برملا پکار اٹھتے ہیں کہ ہمارا جینا، ہمارا مرنا سب اللہ کی طرف سے ہے اور اس کی یقینی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب ہمیں پیدا کیا تھا تو پوچھ کر پیدا نہیں کیا تھا۔ دنیا میں ایک فردِ واحد بھی ایسا نہیں ہے جو اپنی مرضی سے پیدا ہوا ہو یا اپنی مرضی سے ہمیشہ زندہ رہے۔ ہم ان ہی وسائل سے استفادہ کرتے ہیں جو ہمارے لئے پہلے سے تخلیق کر دیئے گئے ہیں۔

(۹۶) بندہ کا سانس خالص شراب کا ایک گھونٹ ہے۔ سوچ کی گہرائی بتاتی ہے کہ ساری دنیا ہی خالص شراب ہے۔ شراب کا ہی ایک گھونٹ زندگی میں پنہاں اسرار کو منکشف کر دیتا ہے۔ بندہ چاہے تو اُسے مستی و قلندری میں گزار دے چاہے خود کو گمراہی میں دفن کر دے۔

(٩٧) زمین پر بسنے والا ہر آدمی جب اپنا تذکرہ کرتا ہے تو کہتا ہے میں مسلمان ہوں، میں ہندو ہوں، میں پارسی ہوں، میں عیسائی ہوں حالانکہ انسان کی اصل 'رُوح' کا کوئی نام نہیں رکھا جا سکتا۔ روشنی ہر جگہ روشنی ہے چاہے وہ عرب میں ہو، عجم میں ہو یا یورپ میں ہو یا ایشیا کے کسی حصے میں ہو۔ اس دنیا میں جو بھی پیغام آیا وہ اپنے الفاظ کے ساتھ قائم ہے۔ عیسائیوں کے لئے بائبل کے الفاظ مذہب کا درجہ رکھتے ہیں اور مسلمانوں کے لئے قرآن مذہب کا پیش رَو ہے۔ ہندو بھگوت گیتا کے الفاظ کی عبادت کرتے ہیں۔ سب آسمانی کتابیں دراصل خدا کے برگزیدہ بندوں کی وہ آوازیں ہیں جو روشنی بن کر تمام عالم میں پھیل گئی ہیں۔

(٩٨) انسان خالصتاً للہ جب کوئی کام کرتا ہے تو اسے ایک بڑی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ وہ خوشی اس کے اندر سما جاتی ہے جو اس کی رُوح کے کونے کونے کو منور کر دیتی ہے۔ اس خوشی سے اس کی رُوح اتنی ہلکی ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے جسم کو لطیف محسوس کرتا ہے۔

(٩٩) اخبارات کے پورے پورے کالم اور کئی کئی سو صفحات کی کتابیں لکھی جا رہی ہیں کہ اس سے نوجوان نسل کی اصلاح مقصود ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ رشد و ہدایت کے ان طوفان خیز دعووں کے ساتھ اگر نوجوان نسل کے بڑوں نے اپنی اصلاح نہیں کی تو حالات نہیں سُدھریں گے۔ ہم یہ بات کیوں بھول رہے ہیں کہ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس کا ذہن سادہ ورق کی طرح ہوتا ہے۔ وہ وہی عادات و اطوار اختیار کرتا ہے جو ماحول میں رائج ہیں۔ ایک فردِ واحد بھی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ بچہ وہی زبان بولتا ہے جو اس کے ماں باپ بولتے ہیں۔ دراصل ہمارے نونہال من حیث القوم ہمارے کردار کی مُنہ بولتی تصویریں ہیں۔

(١٠٠) بعض چیزیں ایسی ہیں جن کو انسان غیر حقیقی کہہ کر سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا اور واہمہ یا خواب و خیال کہہ کر نظر انداز کر دیتا ہے حالانکہ کائنات میں کوئی شے فاضل اور غیر حقیقی نہیں ہے۔ ہر خیال اور ہر واہمہ کے پس پردہ کوئی نہ کوئی کائناتی حقیقت ضرور کارفرما ہوتی ہے۔

۱۰۱ اللہ کے مشن (دین) کو پھیلانا ہر امتی پر فرض ہے۔ اس فرض کی ادائیگی کے لئے پہلے خود اپنا عرفان حاصل کریں۔ خود آگاہی اور اپنی ذات کا عرفان ایسی روحانی کامیابی ہے جس کے ذریعے انسان اپنی دعوت کا سچا نمونہ بن جاتا ہے۔ جو کچھ کہتا ہے عمل و کردار سے اس کا اظہار ہوتا ہے۔ جب وہ دینی اور روحانی مشن کو عام کرنے کے لئے لوگوں کو دعوت دیتا ہے تو پہلے خود اس کی مثال قائم کرتا ہے۔ خدا کو یہ بات انتہائی ناگوار گزرتی ہے کہ دوسروں کو نصیحت کرنے والے خود بے عمل ہوں۔ نبیٔ برحق (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بے عمل دعوت دینے والوں کو انتہائی ہولناک عذاب سے ڈرایا ہے۔

۱۰۲ تمہیں کسی ذات سے تکلیف پہنچ جائے تو اُسے بلا توقف معاف کر دو اس لئے کہ انتقام بجائے خود ایک صعوبت ہے۔ انتقام کا جذبہ اعصاب کو مضمحل کر دیتا ہے۔ تم اگر کسی کی دل آزاری کا سبب بن جاؤ تو اس سے معافی مانگ لو قطع نظر اس کے کہ وہ تم سے چھوٹا ہے یا بڑا، اس لئے کہ جھکنے میں عظمت پوشیدہ ہے۔

۱۰۳ حقوق العباد یہ ہے کہ انسان اس بات کا یقین رکھے کہ ساری نوعیں اللہ کا ایک کنبہ ہے اور میں خود اس کنبے کا ایک فرد ہوں۔ جس طرح کوئی انسان اپنی فلاح و بہبود اور اپنی آسائش کے لئے اصول وضع کرتا ہے اسی طرح ہر انسان پر یہ فرض عائد ہے کہ وہ اپنے بھائی کی آسائش و آرام کا خیال رکھے۔ انبیا اور اہل اللہ کی تاریخ پر اگر نظر ڈالی جائے تو یہ بات مظہر بن کر سامنے آتی ہے کہ تمام انبیائے کرامؑ اور تمام اہل اللہ نے مخلوق کی خدمت کو اپنا نصب العین قرار دیا ہے۔ اللہ کی مخلوق کی خدمت کا سچا اور مخلصانہ جذبہ انسان کے اندر محبت، اخوت، مساوات کو جنم دیتا ہے۔

۱۰۴ قرآن ان لوگوں کو ہدایت بخشتا ہے جو متقی ہیں اور متقی وہ لوگ ہیں جو غیب پر یقین رکھتے ہیں اور یقین کی تعریف یہ ہے کہ آدمی کے اندر باطنی نظر کھل جاتی ہے اور غیب اس کے لئے مشاہدہ بن جاتا ہے۔ جب تک مشاہدہ عمل میں نہ آئے یقین کی تعریف پوری نہیں ہوتی۔

(۱۰۵) صورتِ حال کچھ یوں ہے کہ لوحِ محفوظ میں انفرادی زندگی بھی نقش ہے اور قومی زندگی بھی نقش ہے۔ انفرادی حدود میں کوئی بندہ جب کوشش اور جدوجہد کرتا ہے تو اس کے اُوپر انفرادی فوائد ظاہر ہوتے ہیں۔ قومی اعتبار سے ایک، دو، چار، دس بندے جب کوشش کرتے ہیں تو اس جدوجہد اور کوشش سے پوری قوم کو فائدہ پہنچتا ہے۔ لوحِ محفوظ پر یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ جو قومیں خود اپنی حالت بدلنے کے لئے کوشش کرتی ہیں ان کو ایسے وسائل مل جاتے ہیں جن سے وہ معزز و محترم بن جاتی ہیں اور جو قومیں اپنی حالت میں تبدیلی نہیں چاہتیں وہ محروم ہو کر ذلیل زندگی گزارتی ہیں۔

(۱۰۶) جس فرد کے دل میں شک جاگزیں ہو وہ اللہ کا عارف کبھی نہیں ہو سکتا اس لئے کہ شک شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے جس کے ذریعے وہ آدم زاد کو اپنی رُوح سے دُور کر دیتا ہے۔ رُوحانی قدروں سے دُوری آدمی کے اُوپر علم و آگہی کے دروازے بند کر دیتی ہے۔

(۱۰۷) ماورائی عُلوم سیکھنے والے ہر طالب علم کو یہ بات پوری طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ مخصوص نظریات کی حد بندیاں، کٹ حجتی، انتہا پسندی اور خود کو کسی ایک دو یا زیادہ علوم میں یکتا سمجھنا ناقص طرزِ فکر ہے۔ اور ناقص طرزِ فکر انسان کو یکسوئی اور آزاد ذہن ہونے سے محروم کر دیتی ہے اور جب کوئی بندہ اس نعمت سے محروم ہو جاتا ہے تو اس کے دل و دماغ پر شک اور وسوسے آکاس بیل بن کر پھیل جاتے ہیں۔ یہی وہ المناک صورت ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے "مُہر کی اللہ نے ان کے دلوں کے اوپر اور ان کے کانوں کے اوپر اور ان کی آنکھوں کے اوپر پردہ ہے اور ان کے واسطے بڑا عذاب ہے۔"

(۱۰۸) مٹی کی صورتیں ہمیں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں "اے آدم زاد! تو کیوں خود فراموشی کے جال میں گرفتار ہے؟ یہ سب مٹی ہے جو ٹوٹ کر، بکھر کر، ریزہ ریزہ ہو کر نئے نئے رُوپ میں جلوہ گر ہو رہی ہے۔ تو کیوں مٹی کے سامنے شکست خوردہ نہیں ہو جاتا۔ اس شکست میں تیرے لئے سعادت ہے کہ کبر و نخوت سے بچ جائے گا۔"

(۱۰۹) ہمیں پوری سنجیدگی کے ساتھ، متانت اور بردباری کے ساتھ یہ سوچنا ہوگا کہ مرنے جینے اور جسم کی نت نئی تبدیلیوں کے پیچھے کیا عوامل کام کر رہے ہیں۔ ہم کیوں قائم بالذات نہیں ہو جاتے، کیا ہم بار بار تبدیلیٔ جسم کے سلسلے کو ختم نہیں کر سکتے اور کیا ہم بقائے دوام پا سکتے ہیں، اور کیا ہر آن اور ہر لحظہ جسمانی، ذہنی، شعوری تبدیلی سے نجات پا سکتے ہیں؟ ہمیں سوچنا ہوگا کہ اختلافِ لیل و نہار کے ساتھ ہم بھی کیوں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ جاننے کے لئے ہمیں اپنے دوست کو پہچاننا ہوگا اور جب ہم اپنے سچے، پاک اور ایثار کرنے والے دوست سے واقف ہو جائیں گے تو ردّ و بدل کا یہ لامتناہی سلسلہ ایک نقطہ پر ٹھہر جائے گا ـــــ ہمارا یہ دوست خدا ہے۔

(۱۱۰) رُوحانی سائنس کا طالبِ علم اپنے مشاہدہ اور تجزیہ (ANA-LYSIS) کی بنا پر اس مقصد سے آشنا ہوتا ہے کہ کائنات میں عناصر کی ترتیب، ہم آہنگی، نظم، افادیت و مقصدیت کور چشم شعور کی کارفرمائی نہیں ہے۔ کوئی طاقت ہے، کوئی ہستی ہے جس کے حکم پر ازل تا ابد نظامِ حیات و کائنات قائم ہے۔

(۱۱۱) قانونِ قدرت سے انحراف کی ہزاروں سزائیں ہمارے سامنے ہیں۔ نئے نئے موذی امراض کی یلغار ہے۔ سب کچھ ہوتے ہوئے ہر شخص افلاس کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے۔ اولاد نالائق ہے یا والدین نالائق قرار دیئے جا رہے ہیں۔ قوم بصارت اور بصیرت سے محروم ہو رہی ہے۔ دماغی عارضے آج جتنے عام ہیں اتنے کبھی نہ تھے۔ ذرا زور سے دل دھڑکا اور آدمی لحد میں اُتر گیا۔ عدمِ تحفظ کا عالم یہ ہے کہ پتہ بھی ہلے تو دل سینے کی دیوار سے باہر آجانا چاہتا ہے۔ گھر میں میاں بیوی کی تو تکار ہے۔ نوجوان نسل شادی کے بندھن کو بوجھ سمجھنے لگی ہے۔ وسائل کے انبار ہونے کے باوجود روزی تنگ ہو گئی ہے۔

(۱۱۲) "کائنات میں گھڑی بھر کا تفکر سال بھر کی عبادت سے بہتر ہے۔"
جن قوموں نے کائنات کے اجزائے ترکیبی یعنی افرادِ کائنات کی تخلیق پر غور کیا، وہ سرفراز ہوئیں اور جس قوم نے کائناتی تفکر سے اپنا رشتہ منقطع کیا وہ اقوامِ عالم میں مُردہ قوم بن گئی۔

(۱۱۳) اے میرے بزرگو! میرے اسلاف کی نیابت کے دعویدارو!
اگر تمہیں یقین ہو جائے کہ تمہارا باپ ایک خوفناک ہستی ہے اور وہ تمہارے وجود کو جلا کر خاکستر کر دے گا تو کیا تم اس کے قریب جاؤ گے؟ اے دانشورو، واعظو! تم کیوں ایسے خدا کا تذکرہ کرتے ہو کہ انسان اُسے خوفناک ہستی اور ڈراؤنی ذات سمجھ کر رات دن ڈرتا رہے، لرزتا رہے، اس کے جسم کا ہر عضو کانپتا رہے۔ یہ کون نہیں جانتا کہ ڈر اور خوف دُوری اور جُدائی کا سمبل (SYMBOL) ہے۔ یہ کون تسلیم نہیں کرے گا کہ ڈر گھٹن ہے، ڈر اضطراب ہے، ڈر بے چینی ہے، ڈر اور خوفناکی دو دلوں کے درمیان جُدائی کی ایک دیوار ہے۔

(۱۱۴) زندگی سے مردانہ وار لڑ کر فتح یاب ہونے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ انسان جدوجہد اور کوشش کی حقیقت سے واقف ہو جائے۔ واقفیت یہ ہے کہ زندگی ایک روٹین (ROUTINE) میں گزار دی جائے۔ روٹین یہ ہے کہ ہم سانس لیتے ہیں لیکن کبھی یہ نہیں سوچتے کہ پلک جھپک رہی ہے۔

(۱۱۵) ہم جب زندگی میں کام کرنے والے جذبات کا تذکرہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ جذبات میں تبدیلی رُونما ہوتی ہے۔ گرد و پیش میں اگر خوف و ہراس کی فضا پیدا کر دی جائے تو لوگ خوف زدہ زندگی گزارتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر گرد و پیش میں شجاعت اور بہادری کی فضا ہو تو لوگ بیمار نہیں ہوتے۔ اسی طرح گرد و پیش میں اگر تساہل، کسل مندی اور لاپروائی کے عوامل کارفرما ہوں تو اس ماحول میں رہنے والے اکثر لوگ کاہل اور تساہل پسند ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ماحول میں سے کسل مندی اور تساہل دُور کر دیا جائے تو لوگ باعمل ہو جاتے ہیں اور قوتِ ارادی سے کام لے کر بڑے بڑے کارنامے انجام دیتے ہیں۔

(۱۱۶) کائنات میں موجود ہر شئے مسلسل حرکت میں ہے۔ جو بندے اس وصف کو قبول کر کے جدوجہد کرتے ہیں، وہ کائنات کا رکن بن جاتے ہیں۔ کائنات کی رکنیت انہیں اعلیٰ علیین کے مقام تک پہنچا دیتی ہے جہاں بندے حاکم اور فرشتے محکوم بن جاتے ہیں۔

(۱۱۷) بچوں کو ڈرائیں نہیں کیونکہ ابتدائی عمر میں دماغ میں چھپا ہوا ڈر ساری عمر ذہن سے چمٹا رہتا ہے اور خوف زدہ بچے زندگی میں کوئی بڑا کام سرانجام دینے کے قابل نہیں رہتے۔ اولاد کو ہر وقت سخت سُست کہنا اور ہر وقت بُرا بھلا کہتے رہنا بھی صحیح طرزِ عمل نہیں ہے۔ وہ ڈانٹ ڈپٹ کو روزانہ کا معمول سمجھنے لگتا ہے۔ بچے ناسمجھ ہوتے ہیں۔ ان کی کوتاہیوں پر بیزار ہونے کے بجائے سوچئے کہ آپ بھی ان ہی کی طرح بچّہ تھے اور آپ سے بھی بے شمار کوتاہیاں سرزد ہوتی تھیں حکمت اور بُردباری سے اُن کو سمجھائیے۔ اُن کے سروں پر شفقت سے ہاتھ پھیریئے تاکہ اُن کے اندر اطاعت اور فرماں برداری کے جذبات اُبھر آئیں۔

(۱۱۸) یہ کیسا المناک اور خوفناک عمل ہے کہ ہم دوسروں کو نقصان پہنچا کر خوش ہوتے ہیں۔ درخت ایک ہے۔ پتے اور شاخیں لاتعداد ہیں۔ اگر کوئی شاخ خود اپنے درخت کی جڑ پر ضرب لگائے تو وہ خود کس طرح محفوظ رہ سکتی ہے۔ خوشی اگر ہمارے لئے معراجِ تمنّا ہے تو ہم اپنے ہم جنسوں کو تکلیف پہنچا کر کیسے خوش رہ سکتے ہیں۔

(۱۱۹) کوئی قوم خیر و شر کی تفریق کو نظر انداز کر کے قانون شکنی کا ارتکاب کرنے لگتی ہے تو افراد کے یقین کی قوتوں میں اضمحلال شروع ہو جاتا ہے، عقائد میں شک اور وسوسے در آتے ہیں، انسان زندگی کی حقیقی مسرّتوں سے محروم ہو جاتا ہے اور اس کی حیات کا محور خالقِ کائنات کی بجائے صرف مادّی وسائل بن جاتے ہیں تو آفاتِ ارضی و سماوی کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور بالآخر ایسی قومیں صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہیں۔ اللہ شک اور بے یقینی کو دماغ میں جگہ دینے سے منع کرتا ہے۔ یہ وہی شک اور وسوسہ ہے جس کے سبب آدمؑ کو جنت کی نعمتوں سے محروم ہونا پڑا۔

(۱۲۰) یہ کیسا المیہ ہے کہ ترقی کا مخزن غیر مسلم ہیں اور ہر بربادی، ذلّت اور رُسوائی مسلمان کا امتیازی نشان بن گیا ہے، کیوں؟ اس لئے کہ اسلام کے نام لیواؤں اور مسلم اقوام کے دانشوروں نے شعور و آگہی پر اپنی مصلحتوں کے پہرے بٹھا دیئے ہیں۔

(١٢١) جہاں تک دولت کے انبار جمع کرنے سے عزت و توقیر کے حصول کا تعلق ہے، یہ ایک خود فریبی ہے — ایسی خود فریبی جس سے ایک فردِ واحد بھی انکار نہیں کرسکتا۔ فراعینِ مصر کے محلات، قارون کے خزانے ہمیں بتاتے ہیں کہ دولت نے کبھی کسی کے ساتھ وفا نہیں کی۔ تاریخ خود کو دہراتی رہتی ہے۔ بڑے بڑے شہنشاہوں کے حالات سے کون واقف نہیں ہے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ پوری شان و شوکت اور شاہی دبدبہ کے باوجود مادرِ وطن میں قبر کے لئے جگہ بھی نصیب نہیں ہوئی۔ سونے چاندی کے ذخیروں اور جواہرات کے ڈھیر نے دنیا کے امیر ترین آدمیوں کے ساتھ کتنی وفا کی؟ کیا یہ حقیقت ہمارے لئے درسِ عبرت نہیں ہے؟

(١٢٢) بے یقینی، درماندگی، پریشانی اور عدم تحفظ کے اس دور میں جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہر شخص اپنے چھوٹوں اور اپنے احباب کو برائی سے بچنے کی تلقین کرتا ہے اور خود اس پر عمل نہیں کرتا تو ہمارے سامنے یہ بات آجاتی ہے کہ نصیحت کا اثر اس لئے نہیں ہوتا کہ ہم خود بے عمل ہیں۔

(١٢٣) تعمیر اور تخریب کے دو رُخ ہیں۔ جب تعمیری شعور بروئے کار آتا ہے تو انسان آسمانوں کی رفعت سے بھی اونچا اور سربلند بن جاتا ہے۔ کائنات اس کے لئے مسخر ہوجاتی ہے اور یہ فرشتوں کا مسجود قرار پاتا ہے اور جب یہی انسان اسفل میں گرتا ہے تو اخلاقیات کی تمام حد بندیاں ریزہ ریزہ ہوجاتی ہیں۔ حرص و ہوس اور معیارِ زندگی کا عفریت اسے نگل لیتا ہے۔ ایسی ایسی اختراعات و ایجادات ذہن میں آتی ہیں جو ابلیسیت کا شاہکار ہوتی ہیں اور دماغ کی تمام تعمیری صلاحیتیں تخریب کا لباس پہن کر اللہ کی زمین میں فساد برپا کردیتی ہیں۔ بلاشبہ آج کا سائنسی دور اس کا بیّن ثبوت ہے۔

(١٢٤) خیال اس اطلاع کا نام ہے جو ہر آن اور ہر لمحہ ہمیں زندگی سے قریب کرتی ہے۔ پیدائش سے بڑھاپے تک زندگی کے سارے اعمال محض اطلاع کے دوش پر رواں دواں ہیں۔ کبھی ہمیں یہ اطلاع ملتی ہے کہ ہم ایک بچہ ہیں۔ پھر ہمیں یہ اطلاع ملتی ہے کہ ہم جوان ہیں اور پھر یہی اطلاع بڑھاپے کا روپ دھار لیتی ہے۔

۱۲۵ جدید سائنس کی رُو سے آدمی ایک سو چھبیس عناصر سے مرکّب ہے۔ آگ، پانی، ہوا، مٹی، ہائیڈروجن، ریڈیم، کاربن، نائیٹروجن.... وغیرہ غرضیکہ جتنے بھی عناصر مل کر کسی مادّہ کی تشکیل و تخلیق کرتے ہیں وہ سب آدمی کے اجزائے ترکیبی میں بھی شامل ہیں۔ جب ہم مادّی اعتبار سے آدمی، حیوانات، چرند، پرند، درندے، ذی رُوح اور غیر ذی رُوح مخلوق کا تجزیہ کرتے ہیں تو سب ایک صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ آدمی جہاں افضل ہو کر انسان بنتا ہے اور اس میں جو چیز تمام مخلوق سے افضل و اعلیٰ ہے وہ اس کی قوّتِ ارادی ہے۔ قوّتِ ارادی مضبوط ہو تو کائنات انسان کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہے۔

۱۲۶ شیطانی تفکر، ابلیسی طرزِ فکر اور برائی کے تشخص کی سوچ یہ ہے کہ وہ اپنا عرفان اس طرح رکھتی ہے کہ اس جیسا کوئی نہیں ہے۔ بڑائی اور خودنمائی اس کی گردن کے پٹھوں کو تشنج میں مبتلا کر دیتا ہے۔ چہرہ پر ملائمت، صباحت اور معصومیت کی جگہ بدصورتی اور خشکی اپنا تسلّط جما لیتی ہے۔

۱۲۷ آدمی اور حیوان میں فرق کیا ہے؟ آدمی اور حیوان میں کوئی فرق نہیں۔ آدمی بھی چوپایوں کی طرح دو پیروں سے چلنے والا جانور ہے۔ بصیرت سے دیکھا جائے تو آدمی حیوانات سے ہر لحاظ سے کم تر ہے۔ جتنا یقین ایک چڑیا کو اپنے اوپر ہے آدمی کے اندر اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہے۔ جتنا استغنا ایک چیونٹی میں ہے آدمی اس سے بھی محروم ہے۔ جو کردار آدمی کو حیوانات سے ممتاز کرتا ہے وہ فکر و شعور کے دائرے میں رہتے ہوئے خالقِ حقیقی سے رابطہ ہے۔ اگر کسی بندے کا اپنے خالق سے رابطہ نہیں ہے تو دراصل وہ دو پیروں پر چلنے والا جانور ہے۔

۱۲۸ کیا یہ اپنے اوپر ظلم اور نادانی نہیں ہے کہ گھر میں کھانے پینے کا سامان بھرا ہوا ہے۔ آدمی فاقے کر رہا ہے۔ کیا یہ جہالت نہیں ہے کہ ساری کائنات آدم کے لیے مسخر کر دی گئی اور آدم زاد قید و بند کی زندگی میں ایڑیاں رگڑ رہا ہے اور آدم زاد اپنے اندر کی روشنی دنیا میں پھیلانے کے بجائے ساری کائنات کو اندھیر کر دینا چاہتا ہے۔

(۱۲۹) جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کر ڈالتے ایسے لوگ بالآخر دردناک عذاب میں مبتلا رہتے ہیں۔ دولت کا حصول بُری بات نہیں ہے۔ المیہ یہ ہے کہ ہم نے دولت ہی کو سب کچھ سمجھ لیا ہے اور اس سے پیدا ہونے والی خرابیوں کا زہر معاشرے کی رگوں میں خون کی طرح دوڑ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم سکون کے ایک لمحہ کو بھی ترستے ہیں۔ اور عدم تحفّظ کا احساس ہمارے اُوپر مسلط ہے۔ رشتوں کے تقدّس پر دولت کی چھاپ لگ گئی ہے۔ ایک دوڑ ہے جو ہمیں ہوس پرستی کے خیالی گھوڑے پر آگ کی طرف دھکیل رہی ہے۔

(۱۳۰) دعاؤں کے ساتھ عمل نہ ہو، کردار نہ ہو، اخلاص نہ ہو تو یہ دعائیں بھی زمین کے کناروں سے باہر نہیں نکلتیں۔ اللہ تعالٰے کے قانون کے مطابق وہ دعائیں مقبولِ بارگاہ ہوتی ہیں جن کے ساتھ مسلسل اور پیہم عمل ہو۔ عمل کے بغیر دُعا ایک ایسا جسم ہے جس میں رُوح نہیں ہے اور جب جسم میں سے رُوح نکل جاتی ہے تو اس کی حیثیت ایک لاش کی ہوتی ہے جو کسی کام نہیں آتی۔

(۱۳۱) جب تک آدمی کے یقین میں یہ بات رہتی ہے کہ چیزوں کا موجود ہونا یا چیزوں کا عدم میں چلے جانا اللہ کی طرف سے ہے اس وقت تک ذہن کی مرکزیت قائم رہتی ہے اور جب یہ یقین غیر مستحکم ہو کر بکھر جاتا ہے تو آدمی ایسے عقیدوں اور وسوسوں میں گرفتار ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ ذہنی انتشار ہوتا ہے، پریشانی ہوتی ہے، غم اور خوف ہوتا ہے حالانکہ اگر دیکھا جائے تو یہ بات بالکل سامنے کی ہے کہ انسان کا ہر عمل، ہر فعل، ہر حرکت کسی ایسی ہستی کے تابع ہے جو ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتی لیکن باطنی آنکھ اس کا مشاہدہ کر لیتی ہے۔

(۱۳۲) کائنات کی تخلیق میں بنیادی عنصر یا بنیادی مسالا رنگ اور رنگوں کا امتزاج ہے۔ رنگوں کی مناسبت سے یا رنگوں کی کمی بیشی سے مختلف تخلیقات عمل میں آتی ہیں۔ انسان جو مخلوقات میں سب سے اعلیٰ اللہ کی صناعی ہے اس کی تخلیق روشنیوں کے چھ دائروں میں ہو رہی ہے۔ روشنی کا ہر دائرہ الگ الگ رنگ سے مرکب ہے اور الگ الگ رنگ کا دائرہ ہے۔

(۱۳۳) کتنی مضحکہ خیز ہے یہ بات کہ قرآن کائنات پر ہماری حاکمیت اور سرداری تسلیم کر رہا ہے، ہمارے اوپر حاکمیت اور سرداری کے دروازے کھول رہا ہے اور ہم قرآن کو محض برکت کی کتاب سمجھ کر طاقوں میں سجائے رکھتے ہیں۔ جب کوئی افتاد پڑتی ہے تو اس کی آیات تلاوت کر کے دنیاوی مصائب سے نجات کی دعائیں مانگتے ہیں مگر اس طرف ہماری توجہ مبذول نہیں ہوتی کہ قرآن میں تفکر اگر ہمارا شعار بن جائے اور ہم اس تفکر کے نتیجے میں میدانِ عمل میں اُتر آئیں تو ساری کائنات پر ہماری سرداری مسلّم ہے۔ افسوس کہ ہم ان خزانوں کو نظر انداز کر کے دوسروں کے دست نگر بنے ہوئے ہیں۔

(۱۳۴) خدا کی راہ میں جو کچھ خرچ کریں بے غرض اور لالچ کے بغیر خرچ کریں۔ یہ آرزو ہرگز نہ رکھیئے کہ جن لوگوں کی آپ نے اللہ کے لئے مدد کی ہے وہ آپ کے شکر گزار اور احسان مند ہوں۔ خدا کی راہ میں خرچ کرنا کوئی فخر و مباہات کی بات نہیں ہے۔ یہ تو محض اللہ کا فضل ہے کہ اس نے آپ کو اس قابل بنا دیا ہے کہ آپ کا ہاتھ اُوپر ہے۔

(۱۳۵) ہمارے اطراف میں بکھرے ہوئے مختلف جاندار مٹی کی بنی ہوئی وہ مختلف تصویریں ہیں جو سانس لیتی ہیں۔ ان کی زندگی کا سارا اثاثہ قیاس آرائی ہے۔ یہی قیاس آرائی حواس کی بنیاد ہے۔ جب خیال متحرک ہوتا ہے تو بصارت، سماعت، گویائی، شامہ، مشام اور لمس درجہ بدرجہ ترتیب پا جاتے ہیں۔ چوں کہ ان کی بنیاد قیاس آرائی ہے اس لئے ظاہری حواس میں ہمارا دیکھنا، سمجھنا اور سوچنا حقیقی نہیں ہے۔ اسی لئے روحانیت میں قلبی مشاہدات کو حقیقت کہا جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے۔ "دل نے جو دیکھا جھوٹ نہیں دیکھا۔"

(۱۳۶) یہ نہیں معلوم کہ کہاں سے آیا ہوں اور نہ ہی یہ معلوم ہے کہ منزل کہاں ہے۔ ایسا علم جس کو نہ تو کھو جانے کا علم ہو اور نہ ہی کچھ پا لینے کا علم ہو علم نہیں ہے۔ بے بضاعتی اور کم مائگی کا یہ حال ہے تو ہم حقیقت کے سمندر میں کس طرح غوطہ زن ہو سکتے ہیں۔ حقیقی علم جاننے کے لئے ضروری ہے کہ ہم یہ جانتے ہوں کہ اس دنیا میں پیدائش سے پہلے ہم کہاں تھے اور مرنے کے بعد کون سے عالم میں چلے جاتے ہیں۔

۱۳۷ خرقِ عادت یا کرامت کا ظہور کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے جبکہ بندے کا شعوری نظام لاشعوری نظام سے خود اختیاری طور پر مغلوب ہو جاتا ہے تو اس سے ایسی باتیں سرزد ہونے لگتی ہیں جو عام طور سے نہیں ہوتیں اور لوگ انہیں کرامت کے نام سے یاد کرنے لگتے ہیں۔ یہ سب بھان متی ہے۔ اعمال و حرکات میں خرقِ عادت اور کرامت خود اپنے اختیار سے بھی ظاہر کی جاتی ہے اور کبھی کبھی غیر اختیاری طور پر بھی سرزد ہو جاتی ہے۔ خرقِ عادت آدمی کے اندر ایسا وصف ہے جو مشق کے ذریعے متحرک کیا جا سکتا ہے۔

۱۳۸ موت جب رُوح اور بدن کو الگ کر دے گی تو بدن کا ٹھکانا صرف دو گز زمین کا ٹکڑا ہو گا (وہ بھی اس کے لئے جسے میسر آ جائے)۔ کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد اس جگہ کوئی اور دفن ہو جائے گا۔ اے بندے! تیری زندگی، تیرا وجود، تیری حقیقت کتنی فانی ہے! سب کے لئے چل چلاؤ اور ختم نہ ہونے والا ایک سلسلہ قائم ہے۔ دنیائے فانی کی یہ فانی زندگی عبرت کا مرقع ہے۔

۱۳۹ قرآنِ پاک کو محض ثواب و برکت کا ذریعہ سمجھ کر نہ پڑھیں یا طاقوں کی زینت بنا کر نہ رکھیں۔ بلکہ اس میں تفکر کریں، جیسا کہ غور و فکر کرنے کا حق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فہمِ قرآن عطا کرنے کا ذمہ خود لیا ہے۔ "ہم نے قرآن کا سمجھنا آسان کر دیا ہے، کیا ہے کوئی سمجھنے والا؟" اس آیتِ مبارکہ کی روشنی میں ہم پر یہ لازم ہے کہ اس عطیۂ خداوندی سے فیض اٹھاتے ہوئے قرآنِ پاک میں غور و فکر کو اپنا شعار بنائیں تاکہ ہماری روحیں نورِ ہدایت سے معمور ہو جائیں اور ہم ان صفات کو حاصل کر سکیں جن سے بندے کے لئے آسمان و زمین مسخّر ہو جاتے ہیں۔

۱۴۰ مومن ہر حالت میں ثابت قدم رہتا ہے۔ کیسے ہی حالات کیوں نہ ہوں وہ کبھی نا امیدی کی دلدل میں نہیں پھنستا۔ اللہ کا شکر ادا کرنا اس کا شعار ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جس طرح خوشی کا زمانہ آتا ہے اسی طرح مصائب کا دور آنا ایک ردِ عمل ہے۔ وہ آزمائش کے زمانے میں جدوجہد اور عمل کے راستے کو ترک نہیں کرتا کیونکہ اس کی پوری زندگی ایک مہم اور جدوجہد ہوتی ہے۔

(۱۴۱) سکندر، دارا، شدّاد و نمرود، فراعین اور بڑے بڑے بادشاہ جن کی ہیبت اور بربریت کا یہ عالم تھا کہ لوگ ان کے نام سے لرزتے تھے، وہ جو بڑی بڑی ریاستوں اور مملکتوں کے تاجدار تھے، عوام سے خراج وصول کرتے تھے، خود کو آقا اور عوام کو غلام سمجھتے تھے معلوم نہیں کہ وہ خود اور ان کے تاج و تخت کہاں ہیں؟ ان کو اور ان کی افواج کو جو آندھی اور طوفان بن کر دنیا کے لئے مصیبت بن گئی تھیں مٹی نے نگل لیا۔ یہ بڑے بڑے محلات اور کھنڈرات جو آج اپنی بے بضاعتی پر آنسو بہا رہے ہیں، بالآخر ان کا نام و نشان بھی ایک دن صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا۔

(۱۴۲) اللہ چاہتا ہے کہ آدمی سیکڑوں سال زندہ رہ کر دنیا کی رنگینی میں اپنا کردار ادا کرے اور آدمی کام، کام، صبح کام اور شام کام اور ہائے دنیا، ہائے دنیا کے ختم نہ ہونے والے چکّر میں خود اپنے ارادے اور اختیار سے زندگی کو مختصر کرنے پر تُلا ہوا ہے جب کہ آدم و حوّا کی اولاد یہ بات اچھی طرح جانتی ہے کہ زندگی کو ایندھن بنا کر جمع کی جانے والی ساری پونجی ایک دن موت ہم سے چھین لے گی۔

(۱۴۳) جب تک نوعِ انسانی کے افراد میں کاروباری ذہن کام کرتا رہے گا اسے کبھی سکون میسر نہیں آئے گا۔ ترقی یافتہ قوم اس لئے عذاب میں مبتلا ہے کہ ترقی کے پیچھے اس کا اپنا ذاتی فائدہ ہے۔ ہر ترقی سونے کا ڈھیر جمع کرنے کا ذریعہ ہے۔ غیر ترقی یافتہ قومیں اس لئے پریشان ہیں کہ ان کا کوئی عمل کاروباری تقاضوں سے باہر نہیں ہے۔ وہ اللہ کو بھی اس لئے یاد کرتے ہیں کہ ان کے پیشِ نظر اپنی ذات کے لئے منفعت ہے جب کہ اللہ کے نزدیک یہ طرزِ فکر ناپسندیدہ ہے۔ "جو لوگ میری آیتوں کا کاروبار کرتے ہیں ان کے پیٹ دوزخ کے انگاروں سے بھروں گا۔"

(۱۴۴) گناہ سرزد ہو جائے تو توبہ کرنے میں کبھی تاخیر نہیں کرنی چاہیئے۔ اظہارِ ندامت کے ساتھ، انکسار کے ساتھ، عاجزی کے ساتھ اپنے اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہو کر معافی طلب کیجئے۔ توبہ استغفار سے رُوح مجلّیٰ ہو جاتی ہے۔ اور قلب دُھل جاتا ہے۔ نہایت خلوص اور سچائی کے ساتھ توبہ کرنے سے انسان کی زندگی بدل جاتی ہے۔

(۱۴۵) ہر طرف یہ شور و غوغا برپا ہے کہ موجودہ نسل اسلام سے دُور ہوگئی ہے، اسلاف کی پیروی نہیں کرتی۔ ہم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اسلاف میں ہمارا بھی شمار ہے۔ موجودہ نسل اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات سے دور ہوگئی ہے تو اس میں اس کا قصور کم اور ہمارا زیادہ ہے۔ بچے جب یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے والدین زبان سے اللہ اور رسولؐ کی تعلیمات کا پرچار کرتے ہیں اور ان کا عمل اس کے بالکل برعکس ہے تو ان کے ترقی یافتہ ذہن میں بجز اس کے کوئی بات نہیں آتی کہ مذہب صرف اظہار و بیان کا نام ہے۔ عمل سے اس کا کوئی ربط ضبط نہیں۔

(۱۴۶) پیراسائیکالوجی ایسے اسباق کی دستاویز ہے جن اسباق میں یہ بات وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ سکون کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر استغنا ہو، استغنا کے لئے ضروری ہے کہ قادرِ مطلق ہستی پر توکّل ہو، توکّل کو مستحکم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر ایمان ہو اور ایمان کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر غیب بین نظر متحرک ہو۔ بصورتِ دیگر بندے کو سکون میسّر نہیں آسکتا۔

(۱۴۷) اُداس، غمگین اور پژمردہ چہرے دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایسے مسافر ہیں جن کی کوئی منزل نہیں ہے جب کہ اسلامی زندگی کے دلکش خدوخال اختیار کر کے ہم اپنے اندر غیر معمولی کشش اور جاذبیت پیدا کرسکتے ہیں۔ اہلِ اسلام ہی نہیں بلکہ دوسری قومیں بھی اسلامی اصولوں کی ضیا پاشیوں سے متاثر ہوکر دینِ مبین کی طرف کھنچنے لگتی ہیں۔ اسلام یقیناً ہوا، پانی اور روشنی کی طرح سارے انسانوں کی عام میراث ہے لیکن محض زبانی طور پر اس کا اقرار کرلینا کافی نہیں ہے۔ اس کے لئے ایثار و عمل کا مظاہرہ کرنا ضروری ہے۔

(۱۴۸) نورانی لوگوں کی باتیں بھی روشن اور منور ہوتی ہیں۔ زندگی میں اُن کے ساتھ ایک لمحے کا تقرّب سو سالہ طاعتِ بے ریا سے افضل ہے اور عالمِ قدس میں چلے جانے کے بعد ان کی یاد ہزار سالہ طاعتِ بے ریا سے اعلیٰ اور افضل ہے کہ ایسے مقرّب بارگاہ بندوں کے تذکرے سے آدمی کا انگ انگ اللہ کی قربت کے تصوّر سے رنگین ہوجاتا ہے۔

(۱۴۹) نوعِ انسانی خیالات کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں پر زندگی گزارتی ہے۔ جسمانی نشو و نما برقرار رکھنے کیلئے بھوک طبیعت کا ایک تقاضا ہے۔ یہ تقاضا خیال بن کر ہمارے دماغ پر وارد ہوتا ہے اور ہم اس خیال کی طاقت کے زیرِ اثر کچھ نہ کچھ کھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ علیٰ ہٰذا القیاس زندگی کا ہر تقاضا اسی قانون کا پابند ہے۔ زندگی میں کوئی عمل ایسا نہیں ہے جو خیال سے شروع ہو کر خیال پر ختم نہ ہوتا ہو۔ اعصاب جب تھکان محسوس کرتے ہیں تو طبیعت ہمیں خیال کے ذریعے اس بات سے مطلع کرتی ہے کہ ہمیں آرام کرنا چاہیئے۔ اور ہم سو جاتے ہیں۔

(۱۵۰) ایک مکتبۂ فکر کا خیال ہے کہ انسان کی خوشی اس میں ہے کہ وہ آزادانہ زندگی گزارے۔ لیکن جب ان لوگوں نے زندگی کے ماہ و سال پر سوچنا شروع کیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ انسان کسی بھی حال میں آزاد نہیں ہے کیونکہ ہر مسرّت کے بعد کسی آفت کا آنا لازمی ہے، ہر سُکھ اور چین کے بعد کوئی نہ کوئی فتنہ برپا ہوتا ہے ہر خوشی دراصل ایک غم کا پیش خیمہ ہے اور ہر سکون اضطراب اور بے چینی پر ختم ہوتا ہے

(۱۵۱) آدمی جو خود کو اشرف المخلوقات کہتا اور سمجھتا ہے اگر اپنی ابتدا اور انتہا پر غور کرے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس تعمیر کی پہلی اینٹ سڑاند اور تعفن ہے اور انتہا یہ ہے کہ اس کا خوبصورت جسم کیڑوں کی خوراک بن جاتا ہے۔ باوجود اس واضح اور کھلی حقیقت کے ہر شخص ذاتی منفعت کی خیالی دنیا میں مگن ہے۔ ایک ہی خیال اس کی طلب اور مقصدِ حیات بن کر رہ گیا ہے۔ دولت دولت اور صرف دولت۔ وہ دولت جو ایک ایسی لاانتہا دلدل ہے جس میں گر کر کوئی شخص اشرف حواس میں زندہ نہیں رہ سکتا۔

(۱۵۲) تسخیرِ کائنات اور جنّت کی زندگی نوعِ انسانی کا ورثہ ہے لیکن اس ورثہ کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ انسان اس صلاحیت سے متعارف ہو جو جنّت کی زندگی میں اُسے حاصل تھی۔ اس صلاحیت کا حصول رُوح سے قریب ہوئے بغیر ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ جو شخص اپنے INNER سے واقفیت حاصل کر لیتا ہے وہ ابدی سکون پا لیتا ہے۔

۱۵۳ زمین پر سے خس و خاشاک دُور کرنے کے بعد کوئی پودا لگایا جائے تو وہ جلد نشو و نما پاتا ہے اور جوان ہو کر اچھا پھل دیتا ہے۔ اسی طرح جب ذہن کو پوری طرح صاف کر کے کسی نئے علم کا پودا اس میں لگایا جائے تو وہ بہت جلد برگ و بار لاتا ہے اور سرسبز و شاداب ہو جاتا ہے۔ جس طرح آپ اپنے جسم کا فاسد مادہ خود ہی خارج کر دیتے ہیں یا قدرتی نظام کے تحت وہ خارج ہو جاتا ہے اسی طرح ہیجان، جذبات و خیالات کی کثافت کا اخراج ہونا بھی ضروری ہے۔ جب تک دماغ جذبات و ہیجان کی کثافت سے صاف نہیں ہوتا، آدمی انسان نہیں بنتا۔

۱۵۴ پہاڑ بھی باشعور ہوتے ہیں۔ پہاڑ بھی سانس لیتے ہیں۔ پہاڑ بھی پیدا ہوتے ہیں اور جوان ہوتے ہیں۔ چونکہ تخلیقی فارمولوں میں پہاڑ کی تخلیق اور نشو و نما کا فارمولا الگ ہے اس لئے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ پہاڑ جمے کھڑے ہیں۔ ایک انسان ایک منٹ میں بیس مرتبہ سانس لیتا ہے، پہاڑ پندرہ منٹ میں ایک سانس لیتا ہے۔ ہر نوع میں سانس کی معین مقداریں الگ الگ ہیں۔

۱۵۵ تمام جاندار مٹی سے بنے ہوئے ہیں۔ مٹی سے مُراد روشنیوں کا وہ خلط ملط ہے جس میں تمام رنگ موجود ہیں۔ اسے کُل رنگ روشنی بھی کہا جاتا ہے۔ یہی رنگ درخت کی جڑیں زمین سے حاصل کرتی ہیں اور یہی رنگ شاخوں، پتوں، پھول اور پھل میں نمایاں ہو جاتے ہیں لیکن تخلیق کی یہ طرز دیرپا نہیں۔ جلد ہی یہ تخلیق پھر مٹی بن جاتی ہے پرندے بھی اسی مٹی سے بنے ہوئے ہیں۔ قوتِ پرواز حاصل ہو جانے کے بعد بھی مٹی سے رستگاری حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ وہ مٹی کے دائرۂ کار سے باہر نہیں جا سکتے۔ جلد ہی مٹی کی کشش انہیں پھر مٹی بن جانے پر مجبور کر دیتی ہے۔

۱۵۶ قلندر شعور کے حامل آزاد انسان کی نظر میں خیر خواہ دوست اور دشمن، رشک و حسد کرنے والے، پاکباز اور پاپی، بے لوث اور خود غرض، جاندار اور غیر جاندار سب کی حیثیت یکساں ہو جاتی ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ ہم صرف جاندار اشیا ہیں اور کائنات جاندار اشیا کے لئے صرف اسٹیج ہے۔ کائنات میں ہر فرد اپنا اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔

(۱۵۷) ایک جگہ سیلاب آیا جس میں سارا علاقہ ڈوب گیا۔ لیکن ایک ٹیلے پر پانی نہیں پہنچ سکا۔ انسان اور جنگل کے بہت سے جانور اور کیڑے مکوڑے اُس ٹیلے پر پناہ لینے کے لئے جمع ہو گئے۔ ایک شیر تیرتا ہوا اس ٹیلے کی طرف آیا اور کتے کی طرح ہانپتا ہوا لوگوں کے درمیان زمین پر بیٹھ گیا۔ وہ اس قدر خوف زدہ تھا کہ اُسے گرد و پیش کا ہوش نہیں تھا۔ ایک آدمی اطمینان سے رائفل لے کر اس کی طرف بڑھا اور اس کے سر پر گولی مار دی۔ خوف کے جذبے سے شیر اپنی درندگی کی صفت کو بھی بھول گیا اور خوف کے جذبے نے اُسے بکری سے بھی زیادہ بُزدل بنا دیا۔

(۱۵۸) اپنی زندگی کو عشق و وفا کی چلتی پھرتی، مُنہ بولتی تصویر اور نمونہ بنا دیجئے
بلاشبہ ایسے افراد کو اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کی صف میں شامل کر لیتا ہے جس کا مشاہدہ رُوح کی آنکھیں اور رُوحانی لوگ کرتے ہیں۔ ان مخصوص بندوں کا ایک سلسلہ ہے جس میں شامل ہونے کے بعد انسان کا دل، دماغ اور نفس مطمئن ہو جاتا ہے۔ ایسے بندوں پر رحمتوں، برکتوں اور انوار و تجلیات کی بارش ہوتی رہتی ہے۔

(۱۵۹) اگر فرد کے ذہن میں جنّات اور فرشتوں سے متعلق اطلاعات کا ردّ و بدل نہ ہو تو فرشتے اور جنّات کا تذکرہ زیرِ بحث نہیں آئے گا۔ بہ الفاظِ دیگر کائنات اور کائنات میں موجود جتنی بھی مخلوق ہے اس مخلوق کے خیالات کی لہریں ہمیں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ خیالات کی منتقلی ہی دراصل کسی مخلوق کی پہچان کا ذریعہ بنتی ہے۔ انسان کا لاشعور کائنات کے دُور دراز گوشوں سے مسلسل ایک ربط رکھتا ہے۔ کیوں کہ یہ ربط ہر وقت قائم ہے اس لئے ہم اپنے خیالات کو ایک نقطہ پر مرکوز کر کے اس ربط کے ذریعے اپنا پیغام کائنات کے دور دراز گوشوں تک پہنچا سکتے ہیں۔

(۱۶۰) ہر مذہب میں اپنے پیروکاروں کو متوجہ کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی طریقہ رائج ہے، کہیں گھنٹہ اور گھڑیال بجا کر لوگوں کو پرستش اور عبادت کے لئے جمع کیا جاتا ہے تو کہیں سنکھ بجا کر پجاریوں کو پوجا پاٹ کی دعوت دی جاتی ہے اور لوگوں کو ایک مرکز پر جمع کیا جاتا ہے۔ اسلام نے اُمّتِ مسلمہ کو ایک مرکز پر جمع کرنے اور اللہ کی پرستش کے لئے بلانے کا جو طریقہ وضع کیا ہے اس کا نام "اذان" ہے۔

(۱۶۱) زندگی کے تمام اجزائے ترکیبی ایک طاقت کے پابند ہیں۔ وہ طاقت جس طرح چاہے روک دیتی ہے اور جس طرح چاہے انہیں چلا دیتی ہے۔ قلندر شعور کے بانی قلندر بابا اولیاء رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ

"لوگ نادان ہیں، کہتے ہیں کہ ہماری گرفت حالات کے اوپر ہے۔ انسان اپنی مرضی و منشا کے مطابق حالات میں ردّ و بدل کر سکتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ اگر فی الواقع حالات کے اوپر انسان کو دسترس حاصل ہوتی تو کوئی آدمی غریب نہ ہوتا، کوئی آدمی بیمار نہ پڑتا، کوئی آدمی بوڑھا نہ ہوتا اور کوئی موت کے منہ میں نہ جاتا۔

(۱۶۲) مینارۂ نور قلندر بابا اولیاءؒ نے اپنے پیچھے فکر کی وہ روشنی چھوڑی ہے جس کی راہ نمائی میں آج کی پراگندہ دل نسل اپنے مستقبل کو سنوار سکتی ہے۔ نوعِ انسانی جس ذہنی کشاکش اور دماغی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے اس کی اوّل وجہ یہ ہے کہ اس کے اندر انبیاء کی طرزِ فکر کا انعکاس کم سے کم ہوتا جا رہا ہے اور اس کے اپنے بنائے ہوئے مفروضہ حواس نے اُسے حقیقت آگاہی سے محروم کر دیا ہے۔

(۱۶۳) مادّی اعتبار سے ہمیں یہ بھی علم نہیں ہے کہ سچی خوشی کیا ہوتی ہے اور کس طرح حاصل کی جاتی ہے۔ حقیقی مسرّت سے واقف ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی اصل کو تلاش کریں۔ یہ معلوم کریں کہ پیدائش سے پہلے کہاں تھے اور مرنے کے بعد ہم کہاں چلے جاتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ حقیقی مسرّت اور دائمی خوشی سے ہم آغوش ہونے کے لئے انسان کو سب سے پہلے یہ جاننا چاہیئے کہ زندگی صرف جسمانی حرکات و سکنات پر نہیں ہے، اس حقیقت پر ہے جس حقیقت نے خود اپنے لئے گوشت پوست کے جسم کو لباس بنا لیا ہے۔

(۱۶۴) زمین، آسمان اور اس کے اندر جو کچھ ہے سب کا سب انسان کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے۔ قرآن واشگاف الفاظ میں کہتا ہے کہ لوہے میں انسانوں کے لئے بے شمار فائدے محفوظ ہیں۔ جن لوگوں نے لوہے کی صلاحیتوں کو تلاش کر لیا وہ لوگ قومی اعتبار سے عزت دار ہو گئے۔ مسلمان نے قرآن کی تعلیمات کو نظر انداز کیا تو پوری قوم ذلیل و خوار ہو گئی۔

(۱۶۵) دانشور اس بات پر متفق ہیں کہ بچّے کی تربیت کا پہلا گہوارہ اس کا گھر ہوتا ہے۔ بچّہ جو سُنتا ہے وہ بولتا ہے، جو دیکھتا ہے وہی اس کا علم بن جاتا ہے۔ آج کے دور میں ہم نہیں دیکھتے کہ دادی امّاں نے کبھی یہ کہا ہو کہ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ، خدا کا بنایا رسول ؐ بادشاہ۔ دن رات گانوں کی آوازیں ہمارے اعصاب پر محیط رہتی ہیں۔ رات کو سونے سے پہلے ماں اپنے بچّوں کو یہ تلقین نہیں کرتی کہ کلمۂ شہادت پڑھ کر سونا چاہیئے، نہ کوئی باپ اپنی اولاد کو بیدار ہونے کے بعد کلمۂ طیّبہ پڑھنے کے لئے کہتا ہے۔ کوئی نہیں کہتا کہ دولت پرستی انسانی زندگی کے لئے ناسور ہے۔

(۱۶۶) پیراسائیکالوجی اور سائیکالوجی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ نفسیات داں یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ شعور فکشن ہے حواس کو تسلیم کرتے ہیں اور یہ سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے دو سال کا بچہ ماں باپ کے کہے ہوئے الفاظ دُہرا دیتا ہے جب کہ پیراسائیکالوجی کے علوم حواس کے پس پردہ علوم کی حقیقت منکشف کرتے ہیں۔ یہ علوم بتاتے ہیں کہ زمانیت و مکانیت کا شعور و حواس سے کیا تعلّق ہے۔ اور ان کا ذریعہ (SOURCE) کیا ہے۔

(۱۶۷) پیراسائیکالوجی (PARAPSYCHOLOGY) کی رُو سے ماورائی طاقت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ دماغ کی کارکردگی اور دماغ کے کمپیوٹر کو سمجھ لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب تک عملاً اس نظام سے الگ ہو کر دماغ کی طرف متوجہ نہیں ہوں گے، دماغ کی کارکردگی اور دماغ میں موجود مخفی صلاحیتیں ہمارے سامنے نہیں آئیں گی۔ ان مخفی اور لامحدود صلاحیتوں سے آشنا ہونے کے لئے یہ امر لازم ہے کہ ہم اس بات سے واقف ہوں کہ مفروضہ حواس کی گرفت سے آزاد ہونا ممکن ہے۔

(۱۶۸) انسان کیا ہے؟ روح ہے۔ روح کیا ہے؟ اللہ کا امر ہے۔ ذرا بھی تفکر سے کام لیا جائے تو یہ بات سورج کی طرح روشن ہے کہ ہم بحیثیت مجموعی اور بحیثیت فرد روح ہیں۔ رُوح اللہ کا امر ہے۔ امر اللہ کا ارادہ ہے اور اللہ کا ارادہ جب حرکت میں آجاتا ہے تو کائنات کے مظاہر چھپنے لگتے ہیں۔ اتنی تعداد میں چھپتے ہیں کہ دنیا کی تمام ریاضیات عاجز ہیں۔

(۱۶۹) اے میری ماں، میری بہن، میری لختِ جگر بیٹی! عورت اور مرد ایک اللہ کی تخلیق ہے۔ ہر مرد اور ہر عورت کے اندر ایک اللہ کی رُوح ہے۔ ہر عورت کے اندر بھی وہ تمام صلاحیتیں اور صفات موجود ہیں جو قدرت نے مرد کو ودیعت کی ہیں۔ جب ایک عورت رابعہ بصری بن سکتی ہے تو دنیا کی تمام عورتیں اپنے اندر اللہ کی دی ہوئی صلاحیتوں کو بیدار کر کے اپنے نام اولیاء اللہ کی فہرست میں ثبت کرا سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا انعام عام ہے، آگے بڑھو اور اپنی روحانی طاقت سے نوعِ انسانی کے اوپر سے شیطانی غلبے کو ختم کر دو۔

(۱۷۰) کوئی مسئلہ اس وقت تک قابلِ حل نہیں ہے جب تک صاحب مسئلہ خود اس مسئلے کو حل کرنے پر آمادہ نہ ہو۔ ساری دعائیں، وظیفے اور دوائیں صرف ایک ہی کام انجام دیتی ہیں، وہ یہ کہ سائل بیمار ہو یا پریشانِ حال، اس کے اندر قوتِ ارادی میں اضافہ ہو اور اس کے اندر اتنی دِل پاور پیدا ہو جائے کہ وہ مسائل و معاملات کی بھول بھلیوں سے نکل کر ذہنی یکسوئی کے ساتھ آزاد ہو سکے۔

(۱۷۱) الفاظ کا سہارا لینا در اصل شعوری کمزوری کی علامت ہے اس لئے کہ شعور الفاظ کا سہارا لئے بغیر کسی چیز کو سمجھ نہیں پاتا۔ جب کوئی بندہ ٹیلی پیتھی کے اصول و ضوابط کے تحت خیالات کی منتقلی کے علم سے وقوف حاصل کر لیتا ہے تو اس کے لئے دونوں باتیں برابر ہو جاتی ہیں چاہے کوئی خیال الفاظ کا سہارا لے کر منتقل کیا جائے یا کسی خیال کو لہروں کے ذریعے منتقل کر دیا جائے۔ ہر آدمی کے اندر کمپیوٹر نصب ہے جو خیالات کو معنی اور مفہوم پہنا کر الگ الگ کر دیتا ہے اور آدمی اس مفہوم سے باخبر ہو کر اس کو قبول کرتا ہے یا رَد کر دیتا ہے۔

(۱۷۲) پوری نوعِ انسانی کے افراد زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ و پیوستہ ہیں۔ ایک کڑی کمزور ہو جائے تو ساری زنجیر کمزور ہو جاتی ہے۔ ایک کڑی ٹوٹ جائے تو زنجیر میں جب تک دوسری کڑی ہم رشتہ نہ ہو جائے زنجیر نہیں کہلائے گی۔ اتحاد و یگانگت ماضی کو پُر وقار، حال کو مسرور اور مستقبل کو روشن اور تابناک بنانے کے لئے ہر کڑی کا دوسری کڑی کے ساتھ اتصال ضروری ہے۔

۱۷۳ قرآن بہ آوازِ بلند فرماتا ہے کہ "قرآن تسخیری فارمولوں کی کتاب ہے۔ اقوامِ عالم میں ممتاز ہونے کے لئے اس میں غور کرو، تفکر کرو، اس کو جانو، اس کو پہچانو۔ آخر تم لوگ اللہ کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔" اللہ کی عظمت، بزرگی اور صناعی کو سمجھنے کے لئے اس کی تخلیق اور نظامِ ربوبیت پر غور کرو۔ ایجادات و ترقی اور علم و ہنر کا جو سورج آج مغرب میں روشن ہے کبھی مشرق میں چمکتا تھا اور جب مشرقی اقوام بالعموم اور مسلمانوں نے بالخصوص علم و ہنر کے اس سورج سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا تو علم و ہنر نے بھی مسلمانوں سے اپنا رشتہ توڑ لیا۔

۱۷۴ اگر تجھے کچھ یاد نہیں آتا تو سُن! تو نے کفرانِ عظیم کیا۔ تو نے جان بوجھ کر خود کو تکلیف و رنج کے حوالے کر دیا۔ آزادی کی نعمت کو ٹھکرا کر غلامی کا طوق اپنے گلے میں پہن لیا۔ پابندیوں کو اپنے پیروں کی بیڑیاں بنا لیا۔ تو نے اپنی لامتناہی صلاحیتوں کو تناہیت کے اندھیرے غاروں میں دھکیل دیا۔ تیری ان حرکتوں سے آسمان رو دیا اور فرشتوں نے ندامت سے سر جھکا لیا۔

۱۷۵ عرفانِ نفس، معرفتِ الٰہیہ کا دروازہ انسان پر کھول دیتا ہے اور عرفانِ نفس کے حصول کے سلسلے میں اہلِ روحانیت کو جن مدارج سے گزرنا پڑتا ہے ان میں سب سے پہلا درجہ "لا" ہے یعنی سب سے پہلے انسان کو اپنی روایتی معلومات اور شعوری علم کی نفی کرنی پڑتی ہے اور پھر اس کے بعد روحانیت کے اسی راستے پر چلتے ہوئے انسان ایسے درجہ پر پہنچ جاتا ہے جہاں اس پر اپنی حقیقت آشکار ہو جاتی ہے یعنی نفس کا عرفان حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے سالک کو ایک معیّنہ اور مقررہ راستے پر سفر کرنے کے لئے شیخ یا مرشد کی راہنمائی لازمی ہے۔

۱۷۶ ایک ہی چیز ایک آدمی کے لئے خوشی اور دوسرے کے لئے غم کا باعث ہے۔ ایک چیز کے بارے میں مختلف لوگوں کی مختلف آراء ہوتی ہیں حالانکہ حقیقت ایک اور صرف ایک ہو سکتی ہے۔ عام مشاہدہ ہے کہ ہماری نگاہ کے سامنے مظاہر میں ہر وقت تغیر ہوتا رہتا ہے۔ آبادی ویرانہ میں اور ویرانہ آبادی میں بدل جاتا ہے۔ یہ متغیر دنیا کس طرح حقیقی ہے جب کہ حقیقت میں تغیر نہیں ہوتا۔

۱۷۷ یہ بات ہمارے مشاہدے میں ہے کہ جب ہم کسی سے قربت چاہتے ہیں تو اس کی عادت واطوار اختیار کر لیتے ہیں۔ اگر ہم نمازی سے دوستی کرنا چاہتے ہیں تو نمازی بن جاتے ہیں۔ تاش کھیلنے والے کے ساتھ دوستی کرنا چاہتے ہیں تو تاش کھیلنا شروع کر دیتے ہیں۔ علیٰ ہٰذالقیاس اسی طرح اگر ہم شیطان سے قربت کے خوگر ہیں تو شیطان کے اوصاف پسند کرتے ہیں اور اگر رحمان سے قربت چاہتے ہیں تو رحمان کی صفات اختیار کرتے ہیں اور رحمان کی صفات یہ ہیں کہ وہ اپنی مخلوق کی خدمت میں ہمہ وقت مصروف ہے۔

۱۷۸ دنیا کی ہر چیز ایک ڈگر پر چل رہی ہے۔ نہ یہاں کوئی چیز اچھی ہے نہ بری ہے۔ ایک بات جو کسی کے لئے خوشی کا باعث ہے وہی دوسرے کے لئے پریشانی اور اضمحلال کا سبب بن جاتی ہے۔ یہ دنیا معانی اور مفہوم کی دنیا ہے۔ جو جیسے معانی پہنا دیتا ہے اس کے اوپر ویسے اثرات مرتّب ہو جاتے ہیں۔ پھر کیوں دنیا کے جھمیلوں میں پڑ کر وقت کو برباد کیا جائے۔ یہ جو دو چار سانس کی زندگی ہے اسے ضائع نہ کر۔

۱۷۹ ہم جب کائنات کی تخلیق پر غور کرتے ہیں تو ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ ہماری کائنات اللہ کی آواز ہے۔ اللہ نے جب اپنی آواز میں کُنْ کہا تو ساری کائنات وجود میں آ گئی۔ خدا جب اپنا تعارف کراتا ہے تو کہتا ہے کہ میں مخلوق کا دوست ہوں۔ جس طرح ایک باپ اپنے بیٹے کو نہیں بھولتا اسی طرح خدا بھی اپنی مخلوق کو کبھی فراموش نہیں کرتا۔ وہ خدا جو ہمارا رب ہے، جو ہمارے لئے ہر طرح کے وسائل پیدا کرتا ہے اور ہمیں زندگی کے نئے نئے مراحل اور نئے نئے تجربات سے گزارتا رہتا ہے بلاشک وشبہ ہمارا دوست ہے۔

۱۸۰ تاریخ بتاتی ہے کہ جن قوموں میں دولت پرستی عام ہو گئی وہ قومیں صفحۂ ہستی سے مٹا دی گئیں۔ قومیں گناہوں سے نیست ونابود نہیں ہوتیں۔ گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ شرک ایک ایسا گناہ ہے جو کسی صورت معاف نہیں کیا جاتا اور دولت پرستی سب سے بڑا شرک ہے۔ اس شرک کو مہمیز دینے والے بڑے عوامل میں سے ایک گھناؤنا عمل سُود ہے، سُود جو رزق کو حرام کر دیتا ہے۔

(۱۸۱) بچہ چھوٹا ہوتا ہے تو اپنے ماں باپ کو پیار کرتا ہے، پھر اپنے بہن بھائی کو اور جیسے جیسے بڑا ہوتا ہے وہ اپنے کنبے، سماج، فرقے، ملک، قوم اور نوعِ انسان سے پیار کرنا شروع کر دیتا ہے لیکن اس کے باوجود مطمئن نہیں ہوتا۔ اس کے اندر محبت اور پیار کی تشنگی باقی رہتی ہے۔ آج کا بچہ کل کا بوڑھا ہونے تک پیاسا ہی رہتا ہے اور یہ تشنگی اس وقت تک نہیں بجھتی جب تک وہ نہیں جان لیتا کہ سچا، بے غرض اور عظیم الشان محبوب کون ہے۔ پیار کی پیاس اس وقت بجھ جاتی ہے جب ہم اپنے لازوال محبوب جل جلالہٗ کو آنکھ سے دیکھ لیتے ہیں۔

(۱۸۲) جو لوگ خود شناسی سے آگے اللہ کے راستے پر قدم اُٹھا چکے ہیں ان کے اوپر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ انسانوں کو اُس راستہ پر چلنے کی دعوت دیں جو صراطِ مستقیم ہے اور جس راستہ پر چلنے والے لوگوں پر انعام کیا جاتا ہے اور اُن کے اوپر عرفان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ انہی کاموں کو انجام دینے کے لئے خدا نے آپ کو "خیر اُمّت" کے عظیم لقب سے سرفراز کیا ہے۔

(۱۸۳) ایک دفعہ کچھ جنگی قیدی گرفتار ہو کر آئے۔ ان میں ایک عورت بھی تھی جس کا دودھ پیتا بچہ اس سے بچھڑ گیا تھا۔ وہ مامتا کی ماری ایسے بے قرار تھی کہ جس چھوٹے بچے کو دیکھتی اُسے اپنے سینے سے لگا کر دودھ پلانے لگتی۔ اس عورت کا یہ حال دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے پوچھا "کیا تم توقع کر سکتے ہو کہ ماں اپنے بچے کو خود اپنے ہاتھ سے آگ میں پھینک دے گی؟" صحابہؓ نے عرض کیا "یا رسول اللہ خود پھینکنا تو درکنار، اگر بچہ آگ میں گرنے لگے تو یہ اپنی جان دے کر بھی بچے کو بچائے گی" نبیٔ برحقؐ نے فرمایا "خدا اپنے بندوں پر اس سے زیادہ مہربان ہے۔"

(۱۸۴) انسان ایسی زندگی چاہتا ہے جو فنا سے نا آشنا ہو۔ ایسی صحت چاہتا ہے جو بیماریوں سے متاثر نہ ہو۔ ایسی جوانی چاہتا ہے جو بڑھاپے میں تبدیل نہ ہو لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا۔ جوانی بڑھاپے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ صحت اور تندرستی کے اوپر بیماریوں کا غلبہ بہر حال ہوتا رہتا ہے۔ انسان زندگی کے نشیب و فراز سے کتنا ہی فرار چاہے کامیاب نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ دنیا میں کوئی چیز بے ثباتی سے خالی نہیں۔

(۱۸۵) پریشان حالی اور درماندگی نے ہشت پا بن کر نوعِ انسانی کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے، در آنحالیکہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں نوعِ انسانی وہ مخلوق ہے جو اللہ تعالیٰ کی اُن نعمتوں کی حامل ہے جن کے متحمل ہونے سے سماوات، ارض و جبال نے عاجزی کا اظہار کر دیا تھا۔ قانونِ قدرت ہے کہ جب کوئی قوم صراطِ مستقیم سے بھٹک جاتی ہے تو وہ امتحان کی چکی میں پسنے لگتی ہے تاکہ صعوبتوں، پریشانیوں اور عدم تحفظ کے زہریلے احساس سے محفوظ رہنے کے لئے وہ راستہ تلاش کرے جو فلاح اور سلامتی کا راستہ ہے۔

(۱۸۶) گفتگو میں آدمی کا عکس جھلکتا ہے۔ خوش آواز آدمی کے لئے اس کی آواز تسخیر کا کام کرتی ہے۔ جب بھی کسی مجلس میں یا کسی محفل میں بات کرنے کی ضرورت پیش آئے، وقار اور سنجیدگی کے ساتھ گفتگو کیجئے۔ مسکراتے ہوئے نرمی کے ساتھ میٹھے لہجے میں بات کرنے والے لوگوں کو مخلوق عزیز رکھتی ہے۔ چیخ کر بولنے سے اعصاب میں کھنچاؤ (TENSION) پیدا ہوتا ہے اور اعصابی کھنچاؤ سے بالآخر آدمی دماغی مریض بن جاتا ہے۔

(۱۸۷) اللہ تعالیٰ کی ذات لامتناہی ہے۔ اس لئے اللہ کی صفات کا علم بھی لامتناہی ہے۔ آدم کو اللہ نے جو علم عطا کیا ہے وہ بھی لامتناہی ہے۔ یہ علم سمندر ہے جس کا کوئی کنارا نہیں۔ جب آدم کی حیثیت فرشتوں سے افضل قرار پا گئی تو کائنات میں موجود تمام انواع و موجودات سے آدم افضل ہو گیا، اس لئے کہ آدم کے پاس لامتناہی صفاتی علم ہے۔ اللہ کی صفات کیا ہیں؟ اللہ بحیثیت ذات خالق ہے اور اللہ کی تمام صفات بحیثیت خالق کائنات کے تخلیقی عناصر اور تخلیقی فارمولے ہیں۔ یہی وہ امانت ہے جو آدم کو اللہ نے اپنی رحمتِ خاص سے عطا فرمائی ہے۔

(۱۸۸) اللہ نے ایک تصویر بنائی، ایسی خوبصورت تصویر جو اپنے توازن، اعتدال، معین مقداروں، رنگ و روپ، جذب و کشش اور حُسن کے معیار میں منفرد ہے، یکتا ہے، بے مثال ہے۔ یہ تصویر دیکھتی بھی ہے، سنتی بھی ہے، بولتی بھی ہے، محسوس بھی کرتی ہے اور دوسروں کا دکھ درد بھی بانٹتی ہے۔ اگر کوئی بندہ اس تصویر کو داغ دار کرنا چاہے اور اپنے ظلم و جہالت سے تصویر کو خراب کر دے تو یقیناً یہ سب سے بُری بات ہے۔

(۱۸۹) فعل و عمل میں اپنی ذات کو اوّلیت دینے سے جو خول وجود میں آتا ہے وہ انسان کا رشتہ لازمانیت اور لامکانیت سے منقطع کر دیتا ہے۔ وہ ایک محدود دائرے کے اندر سوچتا، سمجھتا اور محسوس کرتا ہے۔ کائنات ایک ماورار الماورا اور لامحدود ہے۔ جن لوگوں نے اپنے اعمال و افعال کا مرکز و منتہا اللہ کو بنا لیا اور خود کو لامحدود ہستی کے حوالے کر دیا وہ ہر چیز کو اللہ کے واسطے (REFERENCE) سے پہچانتے ہیں۔ ان کے اندر الٰہی رُوح آشکار ہو جاتی ہے۔

(۱۹۰) قرآنِ مجید ہمیں ایسی اخلاقی اور رُوحانی قدروں سے آشنا کرتا ہے جن میں زمان و مکان کے اختلاف سے تبدیلی نہیں ہوتی اور ایسے ضابطۂ حیات سے متعارف کراتا ہے جو دنیا میں رہنے والی ہر قوم کے لئے قابلِ عمل ہے۔ اگر قرآن کی بتائی ہوئی اخلاقی اور رُوحانی قدریں سوئٹزرلینڈ کی منجمد فضاؤں میں زندہ اور باقی رہنے کی صلاحیت رکھتی ہیں تو افریقہ کے تپتے ہوئے صحرا بھی ان قدروں سے مستفیض ہوتے ہیں۔

(۱۹۱) ہر پیدا ہونے والی شے میں کسی نہ کسی رنگ کا غلبہ ضرور ہوتا ہے کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے جو بے رنگ ہو۔ یہ رنگ اور بے رنگ دراصل خالق اور مخلوق کے درمیان ایک پردہ ہے۔ خالق کو مخلوق سے جو چیز الگ اور ممتاز کرتی ہے وہ رنگ ہے۔ انسان کے اندر جب تخلیقی صفات کا مظاہرہ ہوتا ہے یا اللہ اپنے فضل سے تخلیقی صلاحیتوں کا علم بیدار کر دیتا ہے تو بندے کے اوپر یہ بات منکشف ہو جاتی ہے کہ کوئی بے رنگ خیال جب رنگین ہو جاتا ہے تو تخلیق عمل میں آ جاتی ہے۔ اللہ بحیثیت خالق ورائے بے رنگ ہے۔

(۱۹۲) آیئے! سراغ لگائیں کہ وہ کون سے اسباب ہیں جن کی وجہ سے دشمن حاکم اور ہم محکوم بن گئے ہیں۔ دو وجوہات ہیں — دنیا کی محبت اور مرنے کا خوف۔ ایک باہمت اور بہادر انسان جس کا دل خالقِ کائنات کی محبت میں سرشار ہے موت کے کرخت وجود کو اپنے سامنے دیکھ کر مسکراتا ہے۔ تاریخ میں ایسے بے شمار افراد کا تذکرہ ملتا ہے جنہوں نے جامِ شہادت اس طرح ہنستے مسکراتے پی لیا جیسے شہد کا پیالہ ہو۔

(۱۹۳) بیوی کی اہمیت و عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے
کہ وہ احسن الخالقین کی ایسی صنعت ہے جس کو اللہ نے تخلیقِ آدمیت اور اس کی نشوونما
کا مظہر بنا دیا ہے۔ شوہروں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ پوری فراخ دلی کے ساتھ رفیقۂ حیات
کی ضروریات پوری کریں اور اپنی بیویوں کو تنگ نہ کریں۔ اس حق کو خوش دلی کے ساتھ پورا
کرنے کے لئے جدوجہد اور دوڑ دھوپ کرنا پاکیزہ عمل ہے۔ اس عمل کو انجام دینے سے
نہ صرف یہ کہ دنیا میں ازدواجی زندگی کی نعمت ملتی ہے بلکہ اچھا اور مخلص شوہر آخرت میں
بھی اجر و انعام کا مستحق بنتا ہے۔

(۱۹۴) یہاں ہر شے لہروں کے دوش پر رواں دواں ہے۔ یہ لہریں
جہاں زندگی کو خوش آرام بناتی ہیں، مصیبت و ابتلا میں بھی مبتلا کر دیتی ہیں۔ نور کے
قلم سے نکلی ہوئی ہر لکیر نور ہے اور نور جب مظہر بنتا ہے تو روشنی بن جاتا ہے۔ روشنی
کم ہو جائے تو اندھیرا ہو جاتا ہے۔ آدم نے اس اندھیری دنیا میں قید ہونے کو معراج سمجھ
لیا ہے۔ وہ اس بات پر خوش ہے کہ اسے روشنی کے سمندر سے چند قطرے مل جائیں۔

(۱۹۵) محبت پُرسکون زندگی اور اطمینانِ قلب کا ایک ذریعہ ہے۔ اس
لئے کوئی انسان جس کے اندر محبت کی لطیف لہریں دَور کرتی ہیں وہ مصائب و مشکلات
اور پیچیدہ بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے۔ اس کے چہرے میں ایک خاص کشش پیدا ہو جاتی
ہے۔ اس کے برخلاف نفرت کی کثیف، شدید اور گرم لہریں انسانی چہرہ کو جھلس
دیتی ہیں اور دماغ کو اتنا بوجھل اور تاریک کر دیتی ہیں کہ زندگی میں کام آنے والی لہریں
مسموم اور زہریلی ہو جاتی ہیں۔ اس زہر سے انسان طرح طرح کے مسائل اور قسم قسم کی
بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

(۱۹۶) عالمِ رنگ و بو میں جتنی بھی مخلوق ہے وہ سب آپس میں ایک
برادری ہے۔ کہکشانی سیارے ہوں یا اُن سیاروں میں بسنے والی نوعیں یا نوعوں
میں الگ الگ افراد ہوں، سب کے اندر ایک ہی خون دَور کر رہا ہے۔ سب کی
پیدائش ایک ہی فارمولے کے تحت عمل میں آرہی ہے۔ سمندر، پہاڑ، آفتاب و نجوم
سب انسان کے بھائی ہیں۔

(۱۹۷) مٹی صرف خود کو پہچانتی ہے اور اپنے ایک ایک عضو کو اپنی کوکھ سے وابستہ رکھتی ہے۔ مٹی کو اگر ایک فرد مان لیا جائے تو مٹی سے بنی ہوئی ہر چیز مٹی کے اعضا ہیں۔ تانبا، لوہا، جواہرات، سونا، چاندی وغیرہ مٹی کے وہ اعضا ہیں جن پر مٹی کا تشخص قائم ہے۔ آدمی کا جسم بھی مٹی ہے لیکن آدمی چونکہ اللہ کی امانت کا امین ہے اس لئے مٹی کا شعور آدمی کو دوسرے اعضا کے مقابلے میں اپنا قلب سمجھتا ہے اور جب کسی جسم میں قلب متاثر ہو جاتا ہے تو بالآخر جسم مفلوج اور ناکارہ بن جاتا ہے۔ مفلوج اور ناکارہ جسم کی حیثیت زمین پر بوجھ کے سوا کچھ نہیں رہتی۔

(۱۹۸) اللہ کے جو بندے رُوحانی آگہی کے ناپید اکنار سمندر میں اُتر جاتے ہیں ان کے اوپر سے ٹائم اسپیس کی گرفت ٹوٹ جاتی ہے اور زمان سے پیدا شدہ تمام عوامل رنج و غم، پریشانی و اضمحلال، فکر و تردّد سے اپنا رشتہ منقطع کر لیتے ہیں۔ جب کوئی بندہ اس دائرۂ کار میں منتقل ہو جاتا ہے تو اس کے اوپر انعام و اکرام کی بارش ہونے لگتی ہے اور ساری کائنات اس کے گرد گھومتی ہے۔

(۱۹۹) عالمِ انسانی کے قدسی نفس حضرات وہ ہیں جو اپنے اندر کام کرنے والے کہکشانی نظام سے باخبر ہوتے ہیں۔ جب کوئی بندہ اپنے INNER سے واقف ہو جاتا ہے اور آنکھوں کے سامنے سے TIME & SPACE کا پردہ اُٹھ جاتا ہے تو وہ دیکھ لیتا ہے کہ سب کچھ اُس کے اندر ہے۔ انسان کے اندر ایک نقطہ ہے اور یہ نقطہ کائنات کی مائیکرو فلم ہے۔ اس نقطہ کو جب پھیلنے اور نشر ہونے کا موقع دیا جاتا ہے تو ساری کائنات دماغ کی اسکرین پر فلم بن کر متحرک ہو جاتی ہے۔

(۲۰۰) نوعِ انسانی کے لئے معاشرتی، علمی، اخلاقی اور رُوحانی ترقیوں کے اصول و قواعد کھول کھول کر قرآنِ حکیم میں لکھ دیئے گئے ہیں۔ قرآن نوعِ انسانی کا ورثہ ہے۔ نوعِ انسانی میں جو قوم اس ورثہ سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہے قرآن اُس کی رہنمائی کرتا ہے اور جو قوم اس ورثہ سے فائدہ اٹھانا نہیں چاہتی قرآن اُس کی رہنمائی نہیں کرتا۔

(۲۰۱) کائنات کی تخلیق دو رخوں پر کی گئی ہے۔ ایک رُخ سے دُوسرا رُخ ایک مرحلہ ہے اور ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلہ میں قدم رکھنا ایک امتحان ہے۔ آپ ذرا اس بچے کا تصوّر کیجئے جو کمرۂ امتحان میں بیٹھ کر جب پرچہ سامنے آئے تو بجائے پرچہ حل کرنے کے رونا شروع کر دے، فریاد کرنے لگے اور احتجاج کرے کہ میرا امتحان کیوں ہو رہا ہے۔ نشو و نما اور انسانیت کی فلاح اور ترقی کندن ہوئے ہوئے بغیر ممکن نہیں ہے۔ امتحان کی بھٹیوں سے گزر کر ہی سونا کندن بنتا ہے۔ نوعِ انسانی ان بھٹیوں سے نہ گزری ہوتی تو آج بھی لوگ غاروں میں مکیں ہوتے۔

(۲۰۲) یہ بات کس کے علم میں نہیں ہے؟ آدمی اگر پچاس کمروں کا مکان بھی بنا لے تو سوئے گا وہ ایک ہی چارپائی کی جگہ۔ ہوسِ زر میں اگر سونے چاندی کے خزانے جمع کرلے مگر پیٹ کے ایندھن کے طور پر وہ دو ہی روٹی کھاتا ہے مصنوعی رنگینیوں اور خوشبوؤں سے ماحول کو کتنا ہی رنگین اور معطر کر لیا جائے آدمی کے اندر موجود دسترخوان کا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔

(۲۰۳) مسلمان کے پاس رُوحانی علوم کا جتنا بڑا سرمایہ موجود ہے وہ اسی مناسبت سے مفلوکُ الحال ہے۔ مسلمان کے اسلاف نے اس کے لئے حاکمیت اور تسخیرِ کائنات کے بڑے بڑے خزانے ترکے میں چھوڑے ہیں لیکن مسلمان وہ بدنصیب قوم ہے جس نے ہیرے کو پتھر کہہ کر پھینک دیا ہے اور اس خزانے سے مستفیض ہونے کی صلاحیت کھو بیٹھا ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ مصلحتوں کے پیشِ نظر مسلمان کو تفکر کی راہ سے ہٹا دیا گیا ہے۔ اور اس کے سامنے ایسی نہج آگئی ہے جہاں اس کا ہر عمل کاروبار بن گیا ہے۔

(۲۰۴) انسان پیدائش کے بعد سے بڑھاپے تک مسلسل ایک جنگ لڑتا رہتا ہے۔ وہ ہر حال میں فتح یاب ہو کر سرخ رُو ہونا چاہتا ہے لیکن بالآخر جیت بڑھاپے کی ہوتی ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ موت بڑھاپے کے اُوپر چھا جاتی ہے۔ حیات کی ابتدا کتنی ہی شاندار کیوں نہ ہو ہر آن اور ہر لمحہ انسان کو موت کی آنکھ گھورتی رہتی ہے۔

۲۰۵ پیدائش سے موت تک کی زندگی کا احاطہ کیا جائے تو یہی نظر آتا ہے کہ ماں کے پیٹ میں پیدائش کے بعد ایامِ رضاعت (بچپن) میں، لڑکپن، جوانی اور بڑھاپے میں اللہ وہ تمام ضروریات اور وسائل فراہم کرتا ہے جن کی آدمی کو ضرورت پڑتی ہے۔ سُورج، چاند یا زمین کے اندر وسائل پیدا کرنے کی صلاحیت ایک مرکز کے تحت آدمی کی خدمت گزاری میں مصروف ہے۔ خدمت کا یہ سلسلہ ایک مخصوص نظام الاوقات اور قانون کے تحت قائم و دائم ہے، ایسا قانون جو اللہ نے خود بنایا ہے اور خود اس کو جاری رکھے ہوئے ہے۔

۲۰۶ اللہ کی طرزِ فکر یہ ہے کہ وہ اپنی مخلوق کی خدمت کرتا ہے اور اس خدمت کا کوئی صلہ نہیں چاہتا۔ بندہ جب اختیاری طور پر اس طرزِ فکر کو اختیار کر لیتا ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ کی مخلوق کے کام آئے تو اسے قلندر شعور منتقل ہو جاتا ہے۔ اس کے مشاہدات میں بے شمار ایسے واقعات آتے ہیں کہ اس کے اندر یہ یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، جو کچھ ہو چکا ہے یا آئندہ ہونے والا ہے وہ سب ایک فلم ہے۔

۲۰۷ ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ کی مخلوق پرندے اربوں کھربوں کی تعداد میں دانہ چگتے ہیں لیکن یہ معمہ حل نہیں ہوتا کہ کسان جب کھیتی کاٹتا ہے تو ایک دانہ نہیں چھوڑتا، ان پرندوں کے لئے کوئی مخصوص کاشت نہیں ہوتی تو پھر یہ پرندے کہاں سے کھاتے ہیں؟ قانون یہ ہے کہ پرندوں کا غول جب زمین پر اس ارادے سے اُترتا ہے کہ ہمیں دانہ چگنا ہے تو اس سے پہلے کہ ان کے پنجے زمین پر لگیں قدرت وہاں دانہ پیدا کر دیتی ہے۔ اگر پرندوں کی غذا کا دارومدار کسان پر ہوتا تو سارے پرندے بھوک سے مر جاتے۔

۲۰۸ اللہ کی عظمت کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ ایک لفظ میں ساری کائنات کو سمو دیا ہے۔ اس لفظ میں اربوں، کھربوں بلکہ اَنگنت عالم بند ہیں۔ یہ لفظ جب عکس ریز ہوتا ہے تو کہیں عالمِ ملکوت و جبروت آباد ہو جاتے ہیں اور کہیں کہکشانی نظام اور سیّارے مظہر بن جاتے ہیں۔ کتنی اہم بات ہے یہ "لفظ" ہر آن اور ہر لحظہ نئی صورت میں جلوہ فگن ہو رہا ہے۔

(۲۰۹) زمین میں بہت سی جڑی بوٹیاں ایسی پائی جاتی ہیں جن کے بیج خشخاش سے بیس گنا چھوٹے ہوتے ہیں۔ قدرت نے ان کے اندر دو جڑی ہوئی پتیاں، ڈنڈی جو جڑیں بن کر زمین میں پیوست ہو جاتی ہیں، ایک گرہ جو ڈنڈی بنتی ہے اور اس بیج میں جڑ پکڑنے سے پہلے چند روز کی غذا محفوظ رکھی ہے۔ اے عقل والو، غور کرو! تدبر کے ساتھ کائنات کے اندر جھانک کر دیکھو اور اندازہ لگاؤ کہ اتنے کم وسعت بیج میں جب قدرت نے زندگی کا اتنا بڑا ذخیرہ محفوظ کر دیا ہے تو اللہ کے نائب انسان میں کتنے خزانے محفوظ ہوں گے۔

(۲۱۰) نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اپنی جگہ اہم ہیں، فرض ہیں، ضروری ہیں اس لئے کہ ان ارکان کی ادائیگی سے رُوح کو تقویت ملتی ہے، روحانی صلاحیتیں متحرک اور بیدار ہوتی ہیں لیکن یہاں معاملہ اُلٹا اور برعکس ہے کہ یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ رُوح کی صلاحیتیں ہمارے اندر موجود بھی ہیں یا نہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم عمل تو کرتے ہیں، عمل کی حقیقت کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

(۲۱۱) انفرادی یا اجتماعی جدوجہد کے نتیجے میں ترقی نصیب ہوتی ہے اور انفرادی یا اجتماعی تساہل یا عیش پسندی کے نتیجے میں قوموں کو عروج کے بجائے زوال نصیب ہوتا ہے۔ ترقی کے یہی دو رُخ ہیں۔ توقیر کی ایک حالت یہ ہے کہ کسی فرد یا کسی قوم کو دنیاوی عزت، دنیاوی دبدبہ اور دنیاوی شان و شوکت نصیب ہو۔ ترقی کا دوسرا رُخ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ظاہری حالت میں رہتے ہوئے جس فرد یا قوم کی رسائی غیب کی دنیا تک ہوتی ہے دراصل وہی اصلی ترقی اور شان و شوکت ہے۔

(۲۱۲) ہم پیدا ہونے سے پہلے کہاں تھے؟ اس کا آسان سا جواب یہ ہے کہ پیدا ہونے سے پہلے تمام انسان، حیوانات عالمِ اَرواح میں موجود تھے۔ عالمِ اَرواح سے منتقل ہو کر عالمِ ناسوت (مادّی دنیا) میں آ گئے لیکن جب ہم عالمِ اَرواح کا تذکرہ کرتے ہیں تو یہ بات تشریح طلب بن جاتی ہے کہ عالمِ اَرواح کیا ہے؟ عالمِ اَرواح کا علم لامتناہی علم ہے لیکن اللہ نے جن لوگوں کو یہ علم عطا کیا ہے وہ اس علم سے رُوشناس ہیں اور علم اپنے شاگردوں کو منتقل کر دیتے ہیں۔

۲۱۳ قلندر شعور وہ تمام بُت پاش پاش کر دیتا ہے جو انسان کو ماحول سے ورثے میں ملتے ہیں۔ بے یقینی کا بُت، بھوک و افلاس سے خوف کا بت، موت کے ڈر کا بُت، عزت و بے عزتی کا بُت۔ طلسماتی دنیا زیر و زبر ہو جاتی ہے تو اندر (INNER) میں یقین کا ایک ایسا پیٹرن بن جاتا ہے جہاں نظر اللہ کے سوا کچھ نہیں دیکھتی دل اللہ کے سوا کسی اور کو محسوس نہیں کرتا۔ جہاں علم بے عمل جہالت ہے اور جہاں بے یقینی شرک ہے اور یقین جاودانی زندگی ہے۔

۲۱۴ پانی اور مے کوئی الگ الگ چیز نہیں ہے۔ پانی ہو یا شراب دونوں ایک ہی فارمولے کے تحت وجود میں آتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پانی میں تخلیقی فارمولے براہِ راست کام کر رہے ہیں اور شراب تخلیقی فارمولوں میں ردّ و بدل کے ساتھ بنتی ہے۔ شراب کے نام پر لوگ جھگڑتے ہیں۔ آخر وہ کیوں ان رموز و نکات پر غور نہیں کرتے شراب مٹی ہے، ساغر بھی مٹی ہے، ہم خود مٹی ہیں۔ ہم ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں تو ہماری مٹی سے پھر ساغر بن جاتا ہے۔

۲۱۵ قرآن کی آیتوں میں تفکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر علم کی بنیاد روشنی ہے لیکن آدمی تو یہ بھی نہیں جانتا کہ روشنیاں طبیعت اور ماہیت رکھتی ہیں اور روشنیوں میں رجحانات بھی ہوتے ہیں۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ روشنیاں ہی زندگی ہیں روشنیاں ہی زندگی کی حفاظت کرتی ہیں۔ آدمی صرف مٹی کے پتلے سے واقف ہے، اس پتلے سے جس کے اندر اس کی اپنی کوئی زندگی موجود نہیں ہے، جو سڑاند اور خلا سے بنا ہے اور اس کے اندر اپنی ذاتی کوئی حرکت موجود نہیں ہے۔

۲۱۶ آسمانِ علم و آگہی کے خورشیدِ منفرد اور تسخیرِ کائنات کے فارمولوں کے ماہر حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اے منافقو! کلامِ نبوّت سنو۔ آخرت کو دنیا کے عوض فروخت کرنے والو! حق کو مخلوق کے عوض بیچنے والو، باقی کو فنا کے بدلے کاروبار کرنے والو! تمہارا بیوپار سراسر خسارے کا سودا ہے۔ تمہارا سرمایہ تمہیں بربادی کے گڑھے میں دھکیل رہا ہے افسوس تم پر، تم اللہ کے غضب کا ہدف بن رہے ہو۔

(۲۱۷) موجودہ نسل اتنی باشعور ہو چکی ہے کہ اس کے لئے کوئی بات اُس وقت قابلِ قبول ہے جب اُسے فطرت کے مطابق پیش کیا جائے۔ سائنس کی ترقی نے انسانی ذہن کو بڑی حد تک بالغ کر دیا ہے۔ ہماری نسل کے بالغ اور باشعور افراد جب اپنے اسلاف کے ورثہ علم کو فطری قوانین اور سائنسی توجیہات کے مطابق سمجھنا چاہتے ہیں تو انہیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا جاتا ہے کہ مذہب چون و چرا نہیں چاہتا حالاں کہ قرآنِ کریم ہر ہر قدم پر تفکر کی کھلی دعوت دے رہا ہے۔

(۲۱۸) سائنسی تجربات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ نباتات، جمادات، حیوانات اور انسانی زندگی ایک برقی نظام کے تحت رواں دواں ہے۔ انسانی جسم سے حاصل ہونے والی بجلی کی طاقت ایک ٹارچ یا جیبی ریڈیو چلانے کے لئے کافی ہے یہ بات تحقیق سے ثابت ہو چکی ہے کہ کسی درخت کے پتّے پر مکھّی بیٹھ کر اس کے ریشوں کو حرکت دیتی ہے تو اُس پتّے میں برقی رَو دوڑنے لگتی ہے۔ اسی طرح انسان کے اندر بجلی پیدا ہوتی رہتی ہے اور پورے جسم میں دَور کرکے اَرتھ ہو جاتی ہے۔

(۲۱۹) انسان ایک ایسا حیوانِ ناطق ہے جو الفاظ کی لہروں کے ذریعے اپنے خیالات دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دوسرے حیوان جن کو حیوانِ غیر ناطق کہا جاتا ہے اپنے خیالات الفاظ کا سہارا لئے بغیر دوسروں تک منتقل کرتے ہیں اور دوسرے حیوان ان خیالات کو قبول کرتے اور سمجھتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ الفاظ کا سہارا لئے بغیر بھی خیالات اپنے پورے معنی اور مفہوم کے ساتھ منتقل ہوتے رہتے ہیں۔

(۲۲۰) روزہ جسمانی امراض کا مکمل علاج ہے اور رُوحانی قدروں میں اضافہ کرنے کا ایک مؤثر عمل ہے۔ برائیوں سے بچنے کے لئے ایک ڈھال ہے۔ روزہ رکھنے سے جسمانی کثافتیں دور ہو جاتی ہیں اور آدمی کے اندر لطیف روشنیوں کا بہاؤ تیز تر ہو جاتا ہے۔ روشنیوں کے تیز بہاؤ سے آدمی کے ذہن کی رفتار بڑھ جاتی ہے، اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اس کے سامنے فرشتے آجاتے ہیں۔ اور غیب کی دنیا میں خود کو چلتے پھرتے دیکھ لیتا ہے۔

(۲۲۱) خدا وہ ذات اور رب وہ ہستی ہے جو سب کے دل میں موجود ہے

جس طرح دل کی حرکت کے بغیر زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا اسی طرح خدا کے بغیر دل کی حرکت کا تصور بے معنی ہے۔ خدا سب کا دوست ہے اور ایسا دوست ہے جو بار بار ہر ہر جنم میں، پنگوڑے میں، لڑکپن میں، جوانی میں، بڑھاپے میں ہمارے ساتھ رہتا ہے۔ جہاں میں ایک ہوں وہاں دوسرا خدا ہے، جہاں ہم دو ہیں وہاں تیسرا خدا ہے۔

(۲۲۲) مطالعۂ کائنات کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن میں وضو، نماز، صوم و زکوٰۃ، حج، طلاق وغیرہ وغیرہ پر ڈیڑھ سو آیات ہیں، تسخیری فارمولوں اور مطالعۂ کائنات کے متعلق سات سو چھپن آیتیں ہیں۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس میں چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی بات وضاحت کے ساتھ بیان کر دی گئی ہے لیکن مسلمان نے جب سے اس کتاب کو محض آفات و بلیات سے نجات کا ذریعہ سمجھ لیا ہے اس کتاب کے اندر تسخیری فارمولوں اور کائناتی اسرار و رموز سے محروم ہو گیا۔

(۲۲۳) انسان دراصل ایک درخت ہے اور اس کی زندگی کے اعمال و کردار اس درخت کے پھل ہیں۔ درخت اپنی جڑ سے نہیں اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ یہی صورت حال انسانی اعمال کی ہے۔ صداقت کا فیصلہ ماخذ سے نہیں اس کے نتائج سے مرتب ہوتا ہے۔ انسان کا خود اپنا عمل اس کا یقین ہے کہ وہ سچا ہے یا جھوٹا ہے۔ کسی عمل کو پرکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ یہ عمل معاشرہ پر کس طرح اثر انداز ہو رہا ہے۔ اگر اس عمل میں سچائی، گہرائی اور فطرت موجود ہے تو یہ عمل صحیح اور سچا ہے۔

(۲۲۴) جب ہم عقل و شعور کا موازنہ کرتے ہیں تو کوئی آدمی ہمیں زیادہ با صلاحیت نظر آتا ہے، کوئی آدمی کم صلاحیت اور کوئی آدمی بالکل بے عقل ہوتا ہے۔ سائنس خلا (SPACE) میں پہل قدمی کا دعویٰ کر سکتی ہے لیکن ایسی کوئی مثال سامنے نہیں آئی کہ بے عقل آدمی کو عقل مند بنا دیا گیا ہو۔ اللہ ہی اپنی مرضی سے عقل و شعور بخشتا ہے، آدمی کے اندر فکر و گہرائی عطا کرتا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارا ذاتی وصف ہے لیکن جب وہ فکر و گہرائی اُن سے چھین لی جاتی ہے تو اس وقت وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

۲۲۵ موجودات میں ہر چیز کی بنا (BASE) پانی ہے جو صعود و نزول میں رواں دواں ہے۔ ماں کے پیٹ میں یہی پانی شکل بدل کر بچے کی غذا بنتا ہے۔ پھر یہی پانی دودھ بن جاتا ہے، آم کے درخت میں آم، بیر کے درخت میں بیر، سیب کے درخت میں سیب اور کیلے کے درخت میں کیلا بنتا رہتا ہے یعنی میٹر یا مادہ ایک ہے اور مختلف درختوں میں جا کر مختلف صورت میں جلوہ گر ہو رہا ہے۔ یا بدیع العجائب! یہ کیسی صنّاعی ہے اور کیسی عظیم الشان خود مختار قدرت ہے۔

۲۲۶ جب کسی بندے کے اندر یہ بات یقین بن جاتی ہے کہ اس کائناتی نظام میں ہر چھوٹی سے چھوٹی حرکت اور بڑی سے بڑی شے اللہ کے بنائے ہوئے نظام کے تحت قائم ہے تو اس کے اندر یقین کا ایک پیٹرن بن جاتا ہے۔ اس پیٹرن کو جب تحریکات ملتی ہیں اور زندگی میں مختلف واقعات پیش آتے ہیں تو ان واقعات کی کڑیاں اس قدر مضبوط، مستحکم اور مربوط ہوتی ہیں کہ آدمی یہ سوچنے اور ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کائنات کا حاکمِ اعلیٰ اللہ ہے۔

۲۲۷ زندگی کی اچھی دستاویز رکھنے والا انسان خدا کے ساتھ قریبی تعلق رکھتا ہے اور خدا کی قربت سے لُطف اٹھاتا ہے۔ خدا کا ملاپ اُسے بے طلب اور بے توقع ملتا ہے۔ وہ زندگی کے ہر سانس میں خدا سے قربت محسوس کرتا ہے، خدا کو اپنے اندر جلوہ گر دیکھتا ہے، جو خدا کہتا ہے وہ سُنتا ہے اور جو خود خدا سے کہتا ہے خدا اسے قبول کر لیتا ہے۔ پھر اس پر زندگی کے وہ راز منکشف ہوتے ہیں جو عالمین کو معلوم نہیں۔

۲۲۸ ہر آدمی یہ بات جانتا اور سمجھتا ہے کہ خاندان کے افراد جب تک مِل جُل کر یک جائی جذبات کے ساتھ رہتے ہیں ان کی ایک حیثیت ہوتی ہے۔ ان کی اپنی ایک آواز ہوتی ہے، ان کی ایک اجتماعی قوت ہوتی ہے۔ جھاڑو کے تنکے الگ الگ کر دیئے جائیں اور ہر تنکے سے الگ الگ ضرب لگائی جائے چاہے اس کی تعداد ایک ہزار تنک ہو، چوٹ نہیں لگتی۔ لیکن ایک ہزار تنکوں کو ایک جگہ باندھ کر چوٹ لگائی جائے تو جسم پر نیل پڑ جائے گا۔

(۲۲۹) دنیا میں افراتفری کا ایک عالم برپا ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی الجھن میں گرفتار ہے۔ ذہنی سکون ختم ہو گیا ہے۔ عدم تحفظ کے احساس سے حزن و ملال کے سائے گہرے اور دبیز ہو گئے ہیں۔ اس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے کہ ہم آفاتِ ارضی و سماوی کی یلغار کی زد میں ہیں۔ ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی حیثیت سے دیکھا جائے تو فرمانِ خداوندی کے بموجب انسانی معاشرہ میں آباد لوگوں کے جرائم اور ان کی خطا کاریاں آفتوں اور ہلاکتوں کو دعوت دیتی ہیں۔

(۲۳۰) استغنا سے مراد صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی روپے پیسے کی طرف سے بے نیاز ہو جائے۔ روپے پیسے اور خواہشات سے کوئی بندہ بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ ضروریاتِ زندگی اور متعلقین کی کفالت ایک لازمی امر ہے اور اس کا تعلق حق العباد سے ہے۔ استغنا سے مراد یہ ہے کہ آدمی جو کچھ کرے اس عمل میں اس کے ساتھ اللہ کی خوشنودی ہو اور اس طرزِ فکر یا عمل سے اللہ کی مخلوق کو کسی طرح کا نقصان نہ پہنچے۔

(۲۳۱) آپ ذرا لالچ، طمع اور ہوسِ زر کی بندشوں کو توڑ کر تو دیکھئے، کتنا سکون ملتا ہے۔ دنیا کا کوئی آدمی برا نہیں ہوتا۔ خیالات اچھے یا برے ہوتے ہیں۔ آپ کے پاس اگر دولت ہے، اسے اللہ کی راہ میں، سسکتی، روتی اور کراہتی ہوئی مخلوق پر خرچ کیجئے۔ جو کچھ آپ کے پاس ہے اس پر شکر بجا لایئے۔ جو نہیں ہے اس پر کڑھیئے نہیں۔ احساسِ کمتری سے خود کو دور رکھیئے۔ قدر و منزلت، شرافت و نجابت کا معیار دولت نہیں۔ ہر آدمی کے پاکیزہ اور زندہ خیالات ہیں۔

(۲۳۲) نوعِ انسانی کے عاقل اور بالغ شعور افراد زمینی اور آسمانی مناظر اور مظاہرہ کا مطالعہ کریں اور عقل و دانش کی گہرائیوں سے ان پر غور کریں۔

"آپ کہہ دیجئے، مشاہدہ کرو جو کچھ کہ ہے آسمانوں اور زمینوں میں۔ کیا تم مشاہدہ نہیں کرتے؟ کیا تم غور و فکر نہیں کرتے؟ کیا تم تدبر نہیں کرتے؟ خدا کی نظر میں بدترین مخلوق وہ لوگ ہیں جو گونگے بہرے ہیں یعنی گونگے بہرے جیسی زندگی گزارتے ہیں اور تدبر سے کام نہیں لیتے۔" (قرآن)

(۲۳۳) ہمارا دوست خُدا ہمیں تسلسل کے ساتھ سنبھالے ہوئے ہے کہ ہمارا نسلی تشخص برقرار رہے۔ پیدائش کا عمل ایک ہونے کے باوجود کائنات کے ہر وجود کی اپنی الگ ایک شناخت ہے۔ جب ہماری "زمین ماں" ہمارے دکھ سکھ ختم کرنے کے لئے ہمیں اپنی آغوش میں اس طرح سمیٹ لیتی ہے کہ مادّی وجود معدوم ہوجاتا ہے تو خدا، ہمارا دوست، ہمیں دوسری دنیا میں نسلی سلسلہ کے خلاف پیدا کر دیتا ہے۔ مرنے جینے کا یہ سلسلہ ازل سے قائم ہے اور ابد تک قائم رہے گا۔

(۲۳۴) فاصلوں کی جکڑ بندیوں میں پھنسے ہوئے انسان کے اندر ایسی صلاحیتیں موجود ہیں کہ زمین کی طنابیں اس کے ہاتھ میں ہیں۔ ایک سیارے سے دوسرے سیارے، ایک نظامِ شمسی سے دوسرے نظامِ شمسی تک کے فاصلے، خالق کائنات نے اس کو جو بصارت عطا کی ہے وہ مکانی اور زمانی فاصلوں سے ماورا ہے۔ آدمی کو اس کے بنانے والے نے خلاصۂ کائنات بنا کر اپنی تخلیق کا اعلیٰ ترین نمونہ بنایا ہے۔

(۲۳۵) زمین بیمار اور عضوِ ضعیف کی مانند کراہ رہی ہے۔ خدارا میرے اور اپنے اوپر رحم کرو۔ مگر کوئی کان ایسا نہیں جو اس کی سسکتی ہوئی اور غم میں ڈوبی ہوئی آواز کو سُنے۔ اپنی برتری حاصل کرنے کے لئے قوموں نے ایسے ایسے ہتھیار بنالئے ہیں جن کے اوپر موت منڈلا رہی ہے اور ان ہتھیاروں کی موت جو اب انسانوں کی موت کا پیش خیمہ ہے۔ ایک مرتبہ جب کوئی چیز وجود پالیتی ہے تو اس کا استعمال لازمی ہوجاتا ہے۔

(۲۳۶) بے قراری، عدم سکون اور اضطراب سے رستگاری حاصل کرنے کے لئے اسلاف سے جو ہمیں ورثہ ملا ہے اس کا نام مراقبہ ہے۔ مراقبہ کے ذریعے ہم اپنے اندر مخفی صفات کو منظرِ عام پر لا سکتے ہیں۔ خوف و دہشت میں مبتلا، عدم تحفظ کے احساس میں سسکتی اور مصائب و آلام میں گرفتار نوعِ انسانی کے لئے مراقبہ ایک ایسا لائحہ عمل ہے جس پر عمل پیرا ہو کر ہم اپنا کھویا ہوا اقتدار دوبارہ حاصل کر کے زندہ قوموں کی صفوں میں ممتاز مقام حاصل کر سکتے ہیں۔

(۲۳۷) قرآن کو اس عزم، اس ولولے اور ہمت کے ساتھ پڑھیئے کہ اس کی نورانی کرنوں سے ہمیں اپنی زندگی سنوارنی ہے۔ قرآن آئینے کی طرح آپ کے اندر ہر ہر داغ اور ہر دھبے نمایاں کر کے پیش کرتا ہے۔ قرآن ایک ایسی انسائیکلو پیڈیا ہے جس میں ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی بات وضاحت کے ساتھ بیان کر دی گئی ہے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ قرآن میں بیان کردہ نعمتوں سے ہم کتنا فائدہ حاصل کرتے ہیں۔

(۲۳۸) زندگی کا ہر عمل اپنی ایک حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارا یقین ہے کہ جس چیز کا وجود اس دنیا میں ہے یا آئندہ ہوگا، وہ کہیں پہلے سے موجود ہے۔ یعنی دنیا میں کوئی چیز اس وقت تک موجود نہیں ہو سکتی جب تک وہ پہلے سے موجود نہ ہو۔ کوئی آدمی اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ وہ پیدا ہونے سے پہلے کہیں موجود تھا۔ زندگی کے نشیب و فراز، دن رات اور ماہ و سال کے وقفے پہلے سے ایک فلم کی صورت میں ریکارڈ ہیں۔ یہ ریکارڈ کائناتی فلم یا "لوحِ محفوظ" ہے۔

(۲۳۹) جسمِ انسانی کے اوپر ایک اور انسان ہے جو روشنیوں کا بنا ہوا ہے۔ جتنی بیماریاں، الجھنیں اور پریشانیاں انسان کے اوپر آتی ہیں روشنیوں کے انسان میں آتی ہیں، گوشت پوست کے خاکی جسم میں نہیں ہوتیں۔ جسم دراصل ایک اسکرین ہے اور روشنیوں کا انسان فلم ہے۔ فلم میں سے اگر داغ دھبوں کو دور کر دیا جائے تو اسکرین واضح اور صاف نظر آتی ہے۔ بالفاظِ دیگر روشنیوں کے انسان میں سے بیماری کو نکال دیا جائے تو جسم خود بخود صحت مند ہو جاتا ہے۔

(۲۴۰) اولیائے کرام اور عارف باللہ کشف اور الہام سے وابستہ ہوتے ہیں۔ مراقبے کے ذریعے کشف اور الہام کی طرزیں ان کے ذہنوں میں اتنی مستحکم ہو جاتی ہیں کہ وہ مظاہر کے پسِ پردہ کام کرنے والے حقائق سمجھنے لگتے ہیں اور ان کا ذہن مشیتِ الٰہیہ کے اسرار و رموز کو براہِ راست دیکھتا اور سمجھتا ہے اور پھر وہ قدرت کے رازدار بن جاتے ہیں۔ ان روحانی مدارج کے دوران ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ ان حضرات کا ذہن، ان کی زندگی اور زندگی کا ایک ایک عمل رضائے الٰہی کے تابع ہو جاتا ہے

(٢٤١) ایک چیونٹی نے جلیل القدر پیغمبر اور عظیم الشان بادشاہ حضرت سلیمانؑ کے لشکر کی دعوت کی۔ آپ کے لشکر میں انسانوں کے علاوہ جنّات، پرند، چرند، درند بھی شامل تھے۔ ہواؤں اور موسموں پر بھی آپ کی حکومت تھی۔ میزبان چیونٹی کو حضرت سلیمانؑ نے اٹھا کر اپنی ہتھیلی پر رکھ لیا اور پوچھا "بتا تیری سلطنت بڑی ہے یا میری؟" چیونٹی نے کہا "کس کی سلطنت پُرعظمت ہے یہ بات تو اللہ کو معلوم ہے مگر میں یہ جانتی ہوں کہ اس وقت میرا تخت سلیمان کا ہاتھ ہے۔"

(٢٤٢) زمین کا ہر ذرّہ آدم کی تصویر کا عکس ہے لیکن یہی ایک ذرّہ جب متشکّل اور مجسّم ہو جاتا ہے تو فنا کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ آدمی مٹی میں دفن ہو کر پھر مٹی بن جاتا ہے۔ مٹی کے ذرّات بوقلمونی کے ساتھ پھر متشکّل اور مجسّم ہو جاتے ہیں اور پھر فنا کے راستے پر چل کر مٹی میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ تحلیل نفسی کے اس تسلسل اور متواتر عمل سے آدمی کے اندر مٹی کی جفائیں برداشت کرنے کی سکت پیدا ہو جاتی ہے۔

(٢٤٣) محبت سراپا اخلاص ہے، نفرت مجسم غیظ و غضب اور انتقام کے خدوخال پر مشتمل ہے۔ غصہ بھی نفرت کی ایک شکل ہے۔ قرآن کہتا ہے "جو لوگ غصہ کو کھا جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں، اللہ ایسے احسان کرنے والے بندوں سے محبت کرتا ہے۔" نفرت کا ایک پہلو تعصب بھی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص تعصب پر جیا اور مرا وہ مجھ سے نہیں ہے۔ تعصب کرنے والا بندہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شفاعت سے محروم رہتا ہے۔

(٢٤٤) کیسی عجیب بات ہے کہ بندہ اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ، اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ اور اپنی پوری دانائی کے ساتھ فتنوں سے قریب ہونا اپنے لئے سعادت سمجھتا ہے۔ یاد رکھیئے ہر وہ چیز جو عارضی ہے حقیقت نہیں ہوتی اور جو چیز حقیقی نہیں ہے وہ حق سے قربت حاصل نہیں کر سکتی۔ مال ہو یا اولاد یہ سب عارضی تصویریں ہیں۔ بندہ جب ان عارضی تصویروں کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیتا ہے تو یہ سب اس کے لئے مصیبت اور فتنہ بن جاتی ہیں۔

(۲۴۵) یہ بھری پُری دنیا ایک طلسم کدہ ہے۔ اس میں ایسا جادو ہے کہ اس کو سمجھنا رتی، ماشہ تولنے والی عقل کے بس کی بات نہیں۔ غور کیا جائے تو ساری دنیا مٹی کا ایک کھلونا ہے جس کا مقدر بالآخر ٹوٹ کر بکھر جانا ہے۔

پائندہ زندگی کی حقیقت شراب کے ایک گھونٹ کی ہے، مل گیا تو فبہا اور نہ بھی ملا تو کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ شراب چاہیئے جس کا ایک گھونٹ مجھے ٹائم اسپیس کی قید وبند سے آزاد کردے۔

(۲۴۶) دوستوں کی صحبت میں بیٹھ کر وہی رجحانات اور خیالات پیدا ہوتے ہیں جو دوستوں میں کام کر رہے ہیں۔ قلبی لگاؤ اسی سے بڑھانا چاہیئے جس کا ذوق افکار و خیالات اور دوڑ دھوپ اسوۂ حسنہ کے مطابق ہو۔ دوستوں پر اعتماد کیجئے، انہیں افسردہ نہ کیجئے۔ ان کے درمیان ہشاش بشاش رہیئے۔ دوستی کی بنیاد خلوص، محبت اور رضائے الٰہی پر ہونی چاہیئے نہ کہ ذاتی اغراض پر۔ ایسا رویّہ اپنایئے کہ دوست آپ کے پاس بیٹھ کر مسرت زندگی اور کشش محسوس کرے۔

(۲۴۷) اے آدم زاد! اپنے حافظہ کی اسکرین پر پڑے ہوئے پردوں کو چاک کر دے اور اندر جھانک۔ کیا تجھے وہ سہانا زمانہ یاد نہیں آتا جب تو آزاد فضاؤں (جنت) میں سانس لیتا تھا۔ بھوک پیاس کی تکلیف تھی نہ دھوپ تجھے ستاتی تھی۔ نہ کوئی ڈر تھا نہ پریشانی۔ ملال کیا ہے تو اس سے واقف نہ تھا۔ جہاں سے دل چاہے خوش ہو کر کھاتا تھا۔ زمانی مکانی فاصلے تیرے پیر کی زنجیر نہ تھے۔ خوشی سے سرشار پنچھی کی طرح لامکانی وسعتوں میں تیری پرواز زبان زد ملائکہ تھی۔

(۲۴۸) ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جب گلشن زندگی پر خزاں کا پہرا تھا۔ ہر طرف سکوت وانجماد تھا۔ وقت، حرکت اور بے چینی ایک دوسرے سے ناآشنا تھے۔ خدا نے چاہا کہ تنہائی ختم ہو اور سکوت حرکت میں تبدیل ہو جائے، مخلوقات کا ظہور ہو تاکہ اس کی قدرت اور ربوبیت کا مظاہرہ ہو اور مخلوق اس کی عظمت، حکمت اور صنّاعی کو دیکھے اور اس کو پہچانے۔ خدا کا ارادہ صدا لئے "کُن" بن کر گونجا، زندگی نے انگڑائی لی اور حرکت کا آغاز ہوا۔

(۲۴۹) البتہ تو یہ ہے کہ قرآن کے مفہوم کے بارے میں بھی مسلمان متفق نہیں ہیں۔ ایک ایک آیت کی تاویل میں بے شمار اقوال ہیں اور ان اقوال میں سے اکثر ایک دوسرے کے متضاد ہیں جب کہ مفسرین کرام کے پاس کوئی سند ایسی نہیں ہے جس کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ ان میں سے کس کا قول حق ہے۔ اس طرزِ عمل کا یہ نتیجہ نکلا کہ اختلافات کا پودا تناور، گھنا اور لمبا درخت بن گیا یا کل جو درخت ایسا تھا جس کے نیچے بمشکل چند افراد قیام کر سکتے تھے آج اس درخت کے نیچے پوری قوم خوابِ خرگوش میں گم ہے۔

(۲۵۰) ہر تخلیق میں معین مقداریں کام کر رہی ہیں جو ہر نوع کو دوسری نوع سے، ہر فرد کو دوسرے فرد سے ممتاز کر دیتی ہیں۔ مٹی کے ذرات ایک ہی ہیں لیکن ان ذرات کی مقداروں میں ردّ و بدل سے طرح طرح کی تخلیق وجود میں آ رہی ہے۔ مٹی کے یہ ذرات کہیں سرو و سمن، کہیں کوہ و دمن اور کہیں خوش الحان پرند بن جاتے ہیں اور جب بظاہر مٹی کے یہ بے جان ذرات زندگی کو اپناتے ہیں تو رنگ رنگ کائنات میں رنگینی بکھر جاتی ہے۔

(۲۵۱) انبیائے کرام کا مشن یہ رہا ہے کہ وہ اللہ کی مخلوق کی ذہنی تربیت اس نہج پر کریں کہ ان کے اندر آپس میں بھائی چارہ ہو، ایثار ہو، اخلاص ہو اور وہ ایک دوسرے کے کام آئیں۔ جس معاشرے میں خلوص اور محبت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے وہ معاشرہ پُرسکون رہتا ہے اور جس معاشرے میں بے گانگی اور نفرت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے اس معاشرے کے افراد ذہنی خلفشار اور عدمِ تحفظ کے احساس میں مبتلا رہتے ہیں اور سسک سسک کر مر جاتے ہیں۔

(۲۵۲) رنگ و بُو کی اس دنیا کی طرح ایک اور دنیا بھی ہے جو مرنے کے بعد ہمارے اُوپر روشن ہوتی ہے۔ ہم کتنے بدنصیب ہیں کہ ہم نے اس نادیدہ دنیا کی طرف سفر نہیں کیا۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "مر جاؤ مرنے سے پہلے" پر عمل کر کے اگر ہم اُس دنیا سے روشناسی حاصل کر لیں تو اس بات کی توقع کی جا سکتی ہے کہ ناشاد و نامراد زندگی کو مسرت و شادمانی میسر آ جائے گی۔

(۲۵۳) رُوحانی نقطۂ نظر سے جب کوئی بچہ بطنِ مادر سے زمین کی بساط پر آتا ہے تو اس کے اندر پانچ ہزار سال کی عمر گزارنے کے لئے روشنیوں کا ذخیرہ ہوتا ہے، جس کو وہ اپنی نادانی، جھوٹے وقار اور خودنمائی کے اعمال سے اتنا زیادہ خرچ کر دیتا ہے کہ پانچ ہزار سال کی عمر پچاس یا ساٹھ سال کی عمر بن جاتی ہے یعنی پانچ ہزار سال زندہ رہنے والا آدمی اپنی عمر کا اسراف بے جا کر کے پچاس یا ساٹھ سال میں اسے ختم کر دیتا ہے اور مر جاتا ہے۔

(۲۵۴) جسمانی وجود کا انحصار رُوح پر ہے۔ رُوح کا انحصار جسمانی وجود پر نہیں ہے اور اس کی مثال یہ ہے کہ رُوح کے بغیر آدمی کی حیثیت ایک لاش کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ جب تک رُوح گوشت پوست کے وجود سے تعلق رکھتی ہے گوشت پوست کے وجود میں حرکت موجود رہتی ہے اور جب رُوح گوشت پوست کے جسم سے اپنا رشتہ توڑ لیتی ہے تو یہ جسمانی وجود نہ سنتا ہے، نہ بولتا ہے اور نہ محسوس کرتا ہے۔

(۲۵۵) جو قوم دولت پرستی میں مبتلا ہو جاتی ہے، ذلیل و خوار ہو جاتی ہے۔ یہ کوئی کہانی نہیں ہے۔ زمین پر اس کی شہادتیں موجود ہیں۔ بڑی بڑی سلطنتوں اور محلات کے مالک، ان کے عالی شان محلات آج کھنڈرات کی شکل میں زمین پر جگہ جگہ موجود ہیں۔ "کیا یہ لوگ زمین پر گھوم پھر کر نہیں دیکھتے کہ پہلی اقوام کا انجام کیا ہوا۔ وہ لوگ قوت اور تہذیب و تمدن میں ان سے برتر تھے لیکن اللہ نے انہیں ان کے گناہوں کی سزا میں پکڑ لیا اور انہیں کوئی نہیں بچا سکا۔

(۲۵۶) کسی عاقل، بالغ اور باشعور آدمی کو اگر یہ معلوم نہ ہو کہ اس کے ماں باپ کون ہیں تو وہ کتنا ہی ذہین اور قابل کیوں نہ ہو اس کے اوپر احساسِ محرومی مسلط ہو جاتا ہے۔ احساسِ محرومی انسانی زندگی میں ایسا بڑا خلا ہے کہ جس سے انسان دماغی مریض بن جاتا ہے۔ ہم اس بات سے تو وقوف رکھتے ہیں کہ ہمارا وجود ہے لیکن اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ ہمارا پیدا کرنے والا کون ہے۔ الٰہی مشن یہ ہے کہ بندہ جس طرح اپنے ماں باپ سے واقف ہے اسی طرح اپنے خالق سے بھی واقف ہو۔

(۲۵۷) ہر شے کا ایک تشخص ہے خواہ ہم اُسے غیر مرئی سمجھیں اور کوئی اہمیت نہ دیں۔ جب انسان کسی خواہش کی تکمیل کو اپنا نصب العین بنا لیتا ہے تو درحقیقت وہ اس کے تشخص کو اپنے اوپر مسلط کر لیتا ہے۔ اگر انسان کا مطمح نظر ذاتی مفاد ہے تو وہ خاکی جسم میں مقید ہو جاتا ہے جہاں تنگی ہے، گھٹن ہے، اندھیرا ہے۔ وہ اس تشخص کے طول و عرض میں بند رہتا ہے، باہر نہیں نکل سکتا۔ تیرہ و تاریک قید خانے میں بند قیدی کی طرح اس کا رابطہ وسیع و عریض ماورائی رنگین دنیا سے باقی نہیں رہتا۔

(۲۵۸) اگر انسان کے اندر خود سکون ہے وہ دوسروں کے لئے بھی طمانیتِ قلب کا ذریعہ ہے۔ اس کا عکس ٹھنڈا اور عطر بیز ہے تو اس کی رُوحانی کیفیات حقیقی ہیں اور اگر انسان خود سکون سے دُور ہے اور اس کے اُوپر غم کے بادل چھائے رہتے ہیں تو وہ خوف اور ڈر کے خشک اور بے آب و گیاہ پہاڑ دلوں کے دامن میں کراہ رہا ہے۔ یہ کیفیت شیطانی الہام ہے اور اس کی ساری زندگی دھوکا ہے۔

(۲۵۹) قدرت اپنے پیغام کو پہنچانے کے لئے دیئے سے دیا جلاتی رہتی ہے۔ معرفت کی مشعل ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ آخر یہ قطب، غوث، ولی، ابدال، صوفی، مجذوب اور قلندر سب کیا ہیں۔ یہ قدرت کے وہ ہاتھ ہیں جو روحانی روشنی کی مشعل لے کر چلتے رہتے ہیں۔ اس روشنی سے اپنی ذات کو بھی روشن رکھتے ہیں اور دوسروں کو بھی روشنی کا انعکاس دیتے ہیں۔

(۲۶۰) استغنا ایک ایسی طرزِ فکر ہے جس میں آدمی فانی اور مادّی چیزوں سے ذہن ہٹا کر حقیقی اور لافانی چیزوں میں تفکر کرتا ہے۔ یہ تفکر جب قدم قدم چلا کر کسی بندے کو غیب میں داخل کر دیتا ہے تو سب سے پہلے اس کے اندر یقین پیدا ہوتا ہے جیسے ہی یقین کی کرن دماغ میں پھوٹتی ہے غیب کی دنیا آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

(۲۶۱) بڑائی صرف اس کو زیب دیتی ہے جو اپنے اندر ٹھاٹھیں مارتے ہوئے اللہ کی صفات کے سمندر کا عرفان رکھتا ہو، جو اللہ کی مخلوق کے کام آئے کسی کو اس کی ذات سے تکلیف نہ ہو۔

۲۶۲ ہم علم الکتاب حاصل کرکے زمان ومکان یعنی TIME & SPACE کی گرفت کو توڑ سکتے ہیں۔ قرآن کے علوم جاننے والا بندہ وسائل کے بغیر خلا میں پرواز کرنے اور ایک جگہ سے دُور دراز دوسری جگہ کسی چیز کو منتقل کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ آسمانوں اور زمین میں موجود تمام اشیا اس ہی بندہ کے لئے مسخّر ہوتی ہیں۔

۲۶۳ اگر آپ اپنے اللہ، اپنے خالق سے متعارف ہو کر اس کی قربت اختیار کرکے کائنات پر اپنی حاکمیت قائم کرنا چاہتے ہیں تو اللہ کی مخلوق کی خدمت کو اپنا شعار بنا لیجئے۔ بلاشبہ اللہ کی مخلوق سے محبّت رکھنے والے لوگ اللہ کے دوست ہیں اور دوست پر دوست کی نوازشات وکرامات کی ہمیشہ بارش ہوتی رہتی ہے۔

۲۶۴ برائی اور بھلائی کا جہاں تک تعلق ہے، کوئی عمل دنیا میں بُرا ہے نہ اچھا ہے۔ دراصل کسی عمل میں معانی پہنانا اچھائی یا بُرائی ہے۔ معانی پہنانے سے مراد نیت ہے۔ عمل کرنے سے پہلے انسان کی نیت میں جو کچھ ہوتا ہے وہی خیر یا شر ہے۔

۲۶۵ تمام نوعِ انسانی کی تاریخ میں لاکھوں باتیں کرنے والے حکما، فلسفی، ہیئت داں، طبیعاتی ماہرین وغیرہ پیدا ہوئے اور کچھ نہ کچھ کہتے رہے ان میں اختلافِ رائے تھا، کیوں؟ اس لئے کہ حقیقت تک کوئی نہیں پہنچا۔ حقیقت صرف ایک ہوسکتی ہے، ہزاروں لاکھوں نہیں ہوسکتیں۔ اگر یہ لوگ حقیقت سے واقف ہوجاتے تو اختلافِ رائے ہرگز نہیں ہوتا۔

۲۶۶ قیامت کے روز یہ سوال نہیں کیا جائے گا کہ ہم نے اپنی اولاد کو کس قسم کے کھانے کھلائے اور کیسا لباس پہنایا تھا۔ وہاں پوچھا جائے گا کہ تم نے اپنی اولاد کی تربیت کیسے کی تھی؟ صحیح تربیت کرنے والے والدین سرفراز ہوں گے اور یہی وہ لوگ ہیں جو انعام یافتہ ہیں۔

۲۶۷ پاکیزہ نفس اور رُوحانیت سے سرشار لوگوں کی محبّت بندے کو خود شناسی سے قریب کرتی ہے۔ یہ کون لوگ ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جو آپس میں خدا کی خاطر محبت کرتے ہیں۔ بلاشبہ محبت آخرت کی نجات ہے۔

(۲۶۸) فطرت اور جبلت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ جبلت میں ہمارا دوسری نوعوں مثلاً بھیڑ، بکری، گائے، بھینس، کتے، بلی، سانپ، کبوتر، فاختہ وغیرہ کے ساتھ ذہنی اشتراک ہے اور فطرت میں ہم اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ یہ مقام ہمیں ایک ہستی نے جو تمام نوعوں سے ماوراء ہے اور تمام افرادِ کائنات پر فضیلت رکھتی ہے عطا کیا ہے اور یہ عطا ایک فاضل عقل یا تفکر کرنے کی صلاحیت ہے۔

(۲۶۹) ہماری زندگی محض دنیا کے حصول تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ ہماری عبادتیں بھی دکھاوے اور دنیاوی برکتیں سمیٹنے کے لئے مخصوص ہو گئی ہیں۔ ہم اعمال کے ظاہری پہلو کو تو بہت اہمیت دیتے ہیں مگر باطن میں بہتے ہوئے علم و آگہی کے سمندر میں سے ایک قطرۂ آب بھی نہیں پیتے۔

(۲۷۰) سب سے بہترین دوست انسان کا اپنا من ہے۔ جس نے من کو سمجھ لیا اور من کے اندر اپنی مورتی کو دیکھ لیا وہ دوست سے واقف ہو گیا یعنی وہ خود اپنا دوست بن گیا۔

(۲۷۱) خلا سے اس پار آسمانوں کی وسعتوں میں جھانک کر دیکھا جائے تو مایوسیوں، ناکامیوں اور ذہنی افلاس کے سوا ہمیں کچھ نظر نہیں آتا۔ یوں لگتا ہے کہ زمین کے باسیوں کا اپنی ذات سے فرار اور منفی طرزِ عمل دیکھ کر نیلے پربت پر جھلمل کرتے ستاروں کی شمعِ اُمید کی لَو مدھم پڑ گئی ہے۔ وہ انسان جو اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ کرتا ہے ذہنی اعتبار سے حیوانات سے بدتر زندگی گزار رہا ہے جو سکون ایک بلی اور بکری کو حاصل ہے اس کا عشرِ عشیر بھی انسان کو میسر نہیں۔

(۲۷۲) یہ ساری کائنات ایک اسٹیج ڈرامہ ہے۔ اس اسٹیج پر کوئی باپ ہے، کوئی ماں ہے، کوئی بچہ ہے، کوئی دوست ہے، کوئی دشمن ہے، کوئی گناہ گار ہے، کوئی پاکباز ہے۔ دراصل یہ اسٹیج پر کام کرنے والے کرداروں کے مختلف رُوپ ہیں۔ جب ایک کردار یا سب کردار اسٹیج سے اُتر جاتے ہیں تو سب ایک ہو جاتے ہیں اور ان کے اُوپر سے دنیا کی دوئی کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔

(۲۷۳) یہ عجیب سربستہ راز ہے کہ پوری کائنات کے افراد اطلاعات اور خیالات میں ایک دوسرے سے ہم رشتہ ہیں۔ البتہ اطلاعات میں معنی پہنانا الگ الگ وصف ہے۔ بھوک کی اطلاع شیر اور بکری دونوں میں موجود ہے لیکن بکری اس اطلاع کی تکمیل میں گھاس کھاتی ہے اور شیر بھوک کی اس اطلاع کو پورا کرنے کے لئے گوشت کھاتا ہے۔ بھوک کے معاملے میں دونوں کے اندر قدر مشترک ہے۔ بھوک کی اطلاع کو الگ الگ معنی پہنانا دونوں کا جداگانہ وصف ہے۔

(۲۷۴) دین کی دعوت اور روحانی علوم کی اشاعت کے لئے تھوڑا کام کیجئے لیکن مسلسل کیجئے۔ لوگوں کو روحانی صلاحیتوں سے استفادہ کرنے کی دعوت دیجئے اور اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات، تکالیف اور آزمائشوں کا خندہ پیشانی سے استقبال کیجئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ عالی مقام ہے "بہترین عمل وہ ہے جو مسلسل کیا جاتا ہے چاہے وہ کتنا ہی تھوڑا ہو۔"

(۲۷۵) آسمانی صحائف میں بتایا گیا ہے کہ وسائل پر حکمرانی یہ ہے کہ ارادہ کے ساتھ وسائل حرکت میں آجاتے ہیں۔ ارادہ کیا ہے؟ ارادہ رُوح کی لامتناہی تخلیقی صفات کا مظاہرہ ہے۔

(۲۷۶) قرآن کی حقیقی تعلیم اور مسلمانوں کے عمل میں بہت بڑا تضاد واقع ہوچکا ہے۔ قرآن جس راہ کا تعین کرتا ہے اور مسلمان جس راہ پر چل رہا ہے یہ دونوں دو ایسی لکیریں ہیں جو آپس میں کبھی نہیں ملتیں۔

(۲۷۷) جس طرح ستارے اور زمین گردش میں ہیں، کائنات کا ایک ایک ذرہ متحرک ہے۔ انسان جس کے لئے یہ ساری کائنات تخلیق کی گئی ہے وہ بھی ہر لمحہ اور ہر آن جذبات و احساسات کی دنیا میں ردو بدل ہو رہا ہے۔

(۲۷۸) کچھ نہ تھا، اللہ تھا۔ جب اللہ نے چاہا بشمول کائنات ہمیں تخلیق کر دیا۔ تخلیق کی بنیاد (BASE) اللہ کا چاہنا، اللہ کا ذہن ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ہمارا اصل وجود اللہ کے ذہن میں ہے۔

(۲۷۹) لازوال ہستی اپنی قدرت کا فیضان جاری و ساری رکھنے کے لئے ایسے بندے تخلیق کرتی رہتی ہے جو دنیا کی بے ثباتی کا درس دیتے رہتے ہیں۔ خالق حقیقی سے تعلق قائم کرنا اور آدم زاد کو اس سے متعارف کرانا ان کا مشن ہوتا ہے۔

(۲۸۰) کسی سے توقع نہ رکھی جائے، اس لئے کہ جو بندہ کسی سے توقع نہیں رکھتا وہ ناامید بھی نہیں ہوتا۔ اُمیدیں توازن کے ساتھ کم سے کم رکھنی چاہئیں اور ایسی ہونی چاہئیں جو آسانی کے ساتھ پوری ہوتی رہیں۔

(۲۸۱) قلندر شعور ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ ہم کائناتی تخلیقی فارمولوں کے تحت اپنے اندر ہر قسم کی غیر مرئی (INVISIBLE) صلاحیتوں کو اپنے ارادے اور اختیار سے متحرک کر سکتے ہیں۔ ایک آدمی جب اپنے اندر دَور کرنے والی بجلی یا نسمہ (AURA) سے واقف ہو جاتا ہے تو وہ بجلی کے بہاؤ کو روک بھی سکتا ہے اور اپنے اندر زیادہ سے زیادہ وولٹیج کا ذخیرہ بھی کر سکتا ہے اور اس ذخیرہ سے ماورائی دنیا میں بغیر کسی وسیلے کے پرواز بھی کر سکتا ہے۔ الیکٹریسٹی کے ذخیرے کے بعد اس کے اندر ایسی سکت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے آسمان اور زمین کے کناروں سے باہر نکل جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی زمین کی طرح کہکشاں میں بے شمار زمینیں آجاتی ہیں۔ جس طرح وہ اپنی زمین پر آباد اللہ کی مخلوق کو دیکھتا ہے اسی طرح کھربوں دنیاؤں کا بھی مشاہدہ کرتا ہے۔ جس طرح ایک فلم سینکڑوں ہزاروں اسکرین پر دیکھی جا سکتی ہے اسی طرح کائنات کی تمثیل لوح محفوظ سے ڈسپلے (DISPLAY) ہو رہی ہے۔ کائنات میں موجود ہر زمین ایک اسکرین ہے۔ لاشعور بیدار ہو جاتا ہے تو یہ ساری کائنات ایک فلم اور کائنات میں کھربوں زمینیں اسکرین نظر آتی ہیں۔ جو کچھ اس زمین پر ہو رہا ہے بالکل اسی طرح کائنات میں موجود دوسری تمام زمینوں پر بھی یہ نظام جاری و ساری ہے۔

(۲۸۲) قدرت کا چلن یہ ہے کہ کوئی غیر معمولی طاقت اسی کو ملتی ہے جو اس کا موزوں استعمال جانتا ہے اور جو لوگ اس قسم کی طاقت حاصل کرنے کے بعد بے جا فخر اور گھمنڈ کے نشے میں غیر اخلاقی اور غیر انسانی حرکات شروع کر دیتے ہیں اُن سے یہ طاقت چھین لی جاتی ہے۔ اس لئے یاد رکھئے کہ سب سے پہلے آپ کے دل میں اپنی شخصی تعمیر اور پھر تعمیرِ کائنات کا عزم ہونا چاہیئے۔

(۲۸۳) تمام مذاہب کی یہ تعلیم عام ہے کہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے۔ امتحان میں کامیابی فرد اور قوم کے لئے سکون و راحت کا ذریعہ ہے۔ جو فرد یا قوم امتحان میں فیل ہو جاتا ہے، نارِ جہنم اس کا ٹھکانا ہے۔